

WAQAR-E-PAKISTAN
www.waqarpk.com

وقارِ پاکستان

موسمِ سرما اور نئے سال کے حوالے سے
منتخب نظمیں، غزلیں اور مضامین



میاں وقار الاسلام، فاؤنڈر
وقارِ پاکستان



www.marvelsystem.com



ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئر پرسن
ادب سرائے انٹرنیشنل



www.adabsaraae.com



سید قمر عبّاس ہمدانی، بانی
دریچہ ادب ویلفیئر سوسائٹی پاکستان



www.dareechaadab.com



خالد نصر، چیئرمین
دبستانِ خالد نصر، پاکستان



www.dabistanekhalid.com



MS KNOWLEDGE SERIES
WINTER SPECIAL

مارول سسٹم نالج سیریز ونٹر سپیشل

موسمِ سرما اور نئے سال کے حوالے سے منتخب نظمیں غزلیں اور مضامین

معاونین

میاں وقار الاسلام پرنسپل کنسلٹینٹ مارول سسٹم، فاؤنڈر وقارِ پاکستان
ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئرپرسن ادب سرائے انٹرنیشنل، فاؤنڈر وقارِ پاکستان
سید قمر عباس ہمدانی، بانی دریچہ ادب ویلفئیر سوسائیٹی پاکستان، ایگزیکٹیو ممبر وقارِ پاکستان
خالد نصر، چیئرمین دبستانِ خالد نصر پاکستان، ایگزیکٹیو ممبر وقارِ پاکستان

حصہ اول

مضامین

خزاں

تحریر: امین کنجاہی

گرمیاں کا موسم جب اپنے اختتام کی طرف سفر پذیر ہوتا ہے، تو پہلے ساون آتا ہے، ساون میں شدید بارشیں ہوتی ہیں، گہرے بادل چھاتے ہیں، شدید آسمانی بجلی کڑکتی ہے، کبھی دن میں گھپ اندھیرہ چھا جاتا ہے ہے، گھروں میں روشنیاں جل پڑتی ہیں، سڑکوں پر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن ہو جاتی ہیں، غریب عوام بارش سے بچنے کے لئے پناہ ڈھونڈتے ہیں، معاشرے کی ایلٹ کلاس ساون کا موسم انجوائے کرتی ہے، اپنی فیملی کو گاڑیوں میں بیٹھا کر اسلام آباد کی سڑکوں پر نکل پڑتی ہے، پھر بادھوں کا مہینہ آجاتا ہے، اِس مہینے کا بھی اپنا رنگ ہے، اپنا مزاج ہے، اپنا طریقہ کار ہے، ہم جس زمانے میں جی رہے ہیں، اس زمانے میں جہاں تک میرا ناقص علم ہے، تین کلینڈر چل رہے ہیں، ایک بکرمی کلینڈر، اور ایک عیسوی کلینڈر اور تیسرا ہمارا اسلامی کلینڈر، ان تینوں کلینڈروں میں بارہ ماہ، ہوتے ہیں، اور کم وبیش 366ء یا 367 دن بنتے ہیں، جو کہ یہ کلینڈرز چار موسموں پر تقسیم ہوتے ہیں، گرمی، سردی، خزاں، بہار اور آج کا موضوع ہمارا یا موسم ہمارا خزاں کا موسم ہے، اور خزاں کا موسم ساون، بادھو جون جولائی گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے، خاص طور پر عیسوی کلینڈر کے مطابق اور بکرمی کلینڈر کے مطابق اکتوبر کاآخر اور (پو ماہ کا شروعات) جب درختوں سے پتے زرد ہو کر زمین پر گرنے لگ پڑتے ہیں، اور تمام کیاریاں، تمام باغات، اور تمام جنگلات بے لباس ہو جاتے ہیں، ہر طرف قرہِ ارض برہنہ ہو جاتا ہے، اور دن چھوٹے، راتیں لمبی ہو جاتی ہیں، اور یہ موسم اہل عشق کے لئے ہجر و فراق کا موسم ثابت ہوتا ہے، جس میں روح بے چین ہو جاتی ہے، بدن بے جان ہو جاتا ہے، کچھ دیر کے لئے ایسے لگتا ہے، کہ یہ اشجار کی برہنگی ہمیشہ اسی طرح رہے گی، دل کا صحن سوہنا ہو جاتا ہے، ہر طرف اندھیرہ چھا جاتا ہے، مگر جب موسمِ بہار اُمید کی اِک کرن بن کر دلوں میں روشنی پیدا کرتا ہے، مگر جب تک خزاں کا موسم رہتا ہے، بے چینی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، ظاہر اور باطن دونوں بے پردہ ہو جاتے ہیں، اور انسانی رویے، سست پڑ جاتے ہیں، رشتوں میں سرد مہری آجاتی ہے، اور ایسا لگتا ہے، کہ اپنے بچھڑ گئے ہیں، کوئی کسی کا نہیں، جو گرم جوشی گرمیوں کے موسم میں ہوتی ہے، وہ خزاں کے موسم میں ماند پڑ جاتی ہے، مگر پھر بھی حضرتِ انسان اِن تین کلینڈروں کی غلامی میں اپنی زندگی تقسیم کرکے بسر کرتا رہتا ہے، نا جانے اِس میں میرے رب کی کیا حکمت ہے، کہ وہ بچھڑنے اور ملنے کی آنکھ مچولی ازل سے کھیل رہا ہے، اور شاید ابد تک کھیلتا رہے گا، انسان رب کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہے گا، اور کٹ پتلیوں کی طرح اپنی تقدیر کے دھاگے، رب کے روحانی اشاروں پر چلاتا رہے گا، میں جب اپنے اندر کے موسم کو

دیکھتا ہوں اور اُس میں جھانکتا ہوں، اور اُس موسم کے اندر اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، تو میں بڑا بے چین ہو جاتا ہوں، کیونکہ خزاں کا موسم میرے اندر ازلی طور پر آسیب کی مانند چھا چکا ہے، اور میں انتہائی کوشش کرنے کے باوجود بھی اِس آسیب زدہ خزاں کے موسم کو اپنے اندر سے، نہیں نکال سکا، میں نے بہت سے بابوں سے دُعا کرائی، منتیں مانگیں، التجا ہیں کیں، رویا، گڑگڑایاں ساون کی بارش کی طرح، بادھوں کے بادل کی طرح، مگر میں آج تک خزاں رسیدہ درخت کی مانند بے ثمر ہی رہا، میرے اندر کبھی بھی بہار کی قومپلیں کبھی نہ پھوٹ سکیں، کبھی آپ لوگوں نے اپنے اندر کا موسم محسوس کیا ہے، یہ اُن چار موسموں کے علاوہ ہے، میں اِسے پانچواں موسم کہتا ہوں، جو اِنسانی وجود کے اندر جنم لیتا ہے، اور جو اِن چار موسموں سے مل کر بنتا ہے، اِس میں رشتوں کی گرمی، سردی، رویوں کی تلخی، اور خیر و شر کا ملا جلا رُجحان پایا جاتا ہے، میری آپ سب سے جو جو بھی میرے اِس مضمون کو پڑھ رہا ہے، سے درخواست ہے، کہ آپ بھی اپنے اندر ضرور جھانکیں اور دیکھیں، کہ آپ کے اندر کون سا موسم چل رہا ہے، میرے اندر تو مسلسل موسم خزاں ہے، اور مجھے اُس سے عشق ہے، اور عشق بھی ایسا جو کہ مرتے دم تک، میرے ساتھ رہے گا، آیئے چلیں اپنے اپنے اندر سیر کریں، اپنی روح کے موسم کا پتا بھی کریں، اور مزہ بھی لیں، شاید میں کچھ زیادہ جذباتی ہو گیا ہوں کیونکہ دسمبر چل رہا ہے، اور دسمبر وہ مہینہ ہے، جس میں ہر طرف اُداسی، مایوسی اور یاسیت ہے، مگر دسمبر کے آخر میں جنوری کی آمد کی خوشی کی ہلکی سی، نوید بھی موجود ہے، آیئے اپنے اپنے موسموں کو سمیٹیں، اس سے پہلے کہ 16 دسمبر کا موسم ہمارے جسموں میں دوڑتے ہوئے خون کو منجمند کر دے، بات موسمِ خزاں سے چلی تھی، اور سمِ خزاں پر ہی ختم ہونے جا رہی ہے۔۔۔۔

سرد لمحوں کے پل

زرد پتوں کے رنگ

بے ثمر درختوں کے سنگ

میرے آنگن میں پھیلے

میرے قدموں تلے

بکھرے ہوئے خشک پتوں کی

سرسراہٹ جان لیوہ

حقیقت میں بدل جائے نہ

الوداع الوداع الوداع

دسمبر ترا نام تو ہجر ہوتا۔

نہ جانے ادیبوں شاعروں نے دسمبر پر کیسے رومانوی نظمیں کہہ ڈالیں؟کیسے اسے اپنی غزلوں کا موضوع بنالیا؟۔۔ ہمیں تو جب بھی یہ ستم گر ملااس کے دامن میں ہجر ہی ہجر ملا۔۔اس کی آہٹوں میں ،اس کی یخ بستہ راتوں اور کہر آلود صبحوں میں بس بین کرتے ہجر کی آہٹیں ہی سنائی دیں۔ سسکیاں ہی سنائی دیں تاریکیاں ہی دکھائی دیں۔ماتم کرتے لمحے عطا کئےاس نے ہمیں ، درد بھرے نوحے دان کئے۔ دسمبر نے آنگنوں میں کھلے گلاب ٹہنیوں سے نوچ ڈالے اور ہماری آنکھوں کو لہورنگ کر دیا۔ دکھوں اور ہجر کو ہمارے سنگ کر دیا۔ کہر لمحوں میں بھی اس نے ہمیں دھوپ بخشی ، دلوں اک ہوک بخشی۔ تاریکیاں ہم پر مہربان ہوئیں۔ ویرانیاں اسی دسمبر کے مہینے میں ہماری شان ہوئیں۔ابھی تو ہماری آنکھوں میں وہی ہجر سلامت ہے جو دسمبر کی شاموں نے ہمیں خوابوں کی جگہ بخشا تھا۔ابھی تو ہم 16 دسمبر کی وہ خوں رنگ صبح نہیں بھولے تھے جو اپنے دامن میں تاریکیاں لے کر آئی تھی اور جس نے اسی روز ہونے والے سقوط ڈھاکہ کے المیئے کو بھی مات کر دیا۔ہم سے ہمارے جگمگاتے ستارے چھین لئے ہمارے روشن مستقبل کو سیاہ اور بدنما دھبہ لگا دیا۔ابھی تو وہی زخم تازہ تھے بلکہ اب تو وہ ناسور بن چکے ہیں۔ابھی انہی زخموں سے لہورِس رہا تھا،ابھی تو ہاتھ وہی نوحے لکھ رہے تھے۔ابھی توآنکھیں اسی المیئے پر گریہ کناں تھیں اور دکھیاری ماؤں کے کانوں میں اپنے شہزادوں کی چیخیں تھیں اور کان دروازے پر آہٹ کے منتظر تھے۔ابھی تو وہ بے بسی کے ساتھ اور اپنی ویران آنکھوں سے آسمان کو تکتی تھیں۔اے دسمبرابھی تو وہی ایک زخم مندمل نہیں ہوا تھا کہ تیرے ٹھٹھرتی شام نے اپنی یخ بستگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے پھر سے شعلے اگل دئے۔آہ یہ کیسی بے بسی ہے، یہ کیساالمیہ ہے کہ جانے والا مدینے والے کا پیغام عام کرتا کرتا مدینے والے کے پاس چلا گیا۔ دنیا کی ٹیڑھی اور رنگین راہوں کو چھوڑ کر چکا چوند اور چندھیا دینے والی روشنیوں سے دور، بہت دور۔ حق سچ کا اور نور کی حقیقی روشنی کا ہالہ اپنے گرد لپیٹے وہ چلے گئے۔ جنید جمشید ہم سے بچھڑ گئے۔انہوں نے چترال کی سرزمیں کو جنت کا ٹکڑا کہا اس جنت کے ٹکڑے پر اپنی آخری تصویر بنوائی۔ وہاں آخری نماز ادا کی اور پھر جنت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ایک جنید جمشید ہی نہیں گئے ،ایک سچا راہبر ایک سچا انسان ،انسانیت کا خدمت گزار ہی نہیں گیا اور بھی بہت سے لوگ اگلے جہان کو سدھار گئے۔ کتنے ہی گھر اجڑ گئے ،ماؤں کے لختِ جگر گئے سہاگنوں کے دلبر گئے اور دسمبر ہمیں پھر سے ہجر دے گیا۔ میں کیسے پرسہ دوں ان ہجر کے ماروں کہ مجھے معلوم ہے ہجر وہ زخم ہے جس کا کوئی مرہم نہیں۔ یہ وہ درد ہے جس کی دوا نہیں اور یہ وہ دکھ ہے جس کا کوئی دلاسہ نہیں۔ سوائے دسمبر تو ہمیں کتنے اور دکھ دے گا... اب تیری ٹھنڈی سرد ہواؤں کو کرونا کی وبائیں لکھنا پڑے گا.. جو تحفہ پچھلے سال جاتے جاتے تو نے دیا اسکی سوغاتیں ہم سمیٹتے سمیٹتے ہم درد اور تکلیف سے چیخ پڑے اور یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے

اللہ ہم شرمندہ ہیں

تیرے در پہ آج یہ گریہ کناں ہے زندگی
میرے مولا اب تو بس محوِ فغاں ہے زندگی

زمین رو رہی ہے اپنی بے بسی پہ آج کل
کہ دیر اور حرم میں بھی تو اب فغاں ہے زندگی

اک ردائے خوف میں لپٹ گئے ھیں سب مکاں
مکیں سہم کے پوچھتے ہیں تو کہاں ہے زندگی

تو اپنے دل پہ ہاتھ رکھ اور اے بشر مجھ کو بتا
کہ اب سجود میں ترے یہ کیوں گراں ہے زندگی

خدائے لم یزل کی رحمتوں سے مت ہو بدگماں
یقیں کی آنکھ سے پرے تو بس گماں ہے زندگی

اپنے شعلوں میں ہی جل کے راکھ ہونے لگ گئی۔
اپنے ہی رد عمل سے اب دھواں ہے زندگی

کل تلک جو رقص فرما تھی لہو کی تال پر
ظلمتوں کے قہر میں اب نوحہ خواں ہے زندگی

اے خدا تو بخش دے ہر اک خطا اُنسانُ کی
دیکھ کیسے ہر طرف اب بے نشاں ہے زندگی

ہے آنکھ رت یہ ہجر کی، لبوں پہ تشنگی بہت
جو خاک کا بدن ہے اس میں تُو کہاں ہے زندگی

تماشہ ہے یہ آنکھ کا، یا دل کا بس فریب ہے
کہ بس زیاں کے کھیل میں ہی رائیگاں ہے زندگی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

دسمبر کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ ۔۔ذوالقرنین سرور

:درخواست برائے تشریح

ہمارے حال پر رویا دسمبر

وہ دیکھو ٹوٹ کر برسا دسمبر

گزر جاتا ہے سارا سال یوں تو

نہیں کٹتا مگر تنہا دسمبر

بھلا بارش سے کیا سیراب ہوگا

تمھارے وصل کا پیاسا دسمبر

وہ کب بچھڑا، نہیں اب یاد لیکن

بس اتنا علم ہے کہ تھا دسمبر

یوں پلکیں بھیگتی رہتی ہیں جیسے

میری آنکھوں میں آ ٹھہرا دسمبر

جمع پونجی یہی ہے عمر بھر کی

مری تنہائی اور میرا دسمبر

دراصل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دسمبر کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟؟؟؟

تشریح:

ہمارے حال پر رویا دسمبر

وہ دیکھو ٹوٹ کر برسا دسمبر

شاعر دسمبر کی اوس کو بھی اغیار کی طعنہ زنی سمجھ رہا ہے۔ کتابی باتوں نے شاعر کا دماغ اتنا خراب کر دیا ہے کہ وہ یہ بھی بھول بیٹھا ہے کہ ساون دسمبر میں نہیں آتا۔ اصل میں شاعر اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے کی بجائے انکی کوئی وجہ تلاش کرنے کے چکر میں ہے۔ اب اور کوئی نہ ملا تو یہ الزام اس نے مہینے کے سر منڈھ دیا۔

گزر جاتا ہے سارا سال یوں تو

نہیں کٹتا مگر تنہا دسمبر

کوئی اللہ کا بندہ پوچھے کہ جہاں سارا سال گزرا وہاں ان اکتیس دنوں کو کیا بیماری ہے۔ مگر نہ جی۔ اصل میں شاعر نے یہاں استعارے سے کام لیا ہے۔ کہ اپنے گھر والوں کے سامنے شادی کا ذکر کس طرح کرے۔ سو اس نے دسمبر کا کاندھا استعمال کرنے میں رتی بھر رعایت نہیں کی۔

بھلا بارش سے کیا سیراب ہوگا

تمھارے وصل کا پیاسا دسمبر

اسی موضوع کو شاعر نے جاری رکھا ہے۔ جب پہلے شعر پر کوئی رد عمل نہ ہوا اور گھر والوں کی طرف سے کسی قسم کی پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ تو شاعر کا لہجہ ذرا بیباک ہو گیا۔ اور اس نے کھلے الفاظ میں وصل کی تمنا ظاہر کرنی شروع کر دی۔ شاعر کو اخلاقی سدھار کی اشد ضرورت ہے۔

وہ کب بچھڑا، نہیں اب یاد لیکن

بس اتنا علم ہے کہ تھا دسمبر

یہاں پر شاعر نے اپنی نام نہاد محبت کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ اگر اسے محبوب سے الفت ہوتی تو اسے وقت اور دن یاد ہونا چاہئے تھا۔ مگر شاعر کو تو عشرہ بھی یاد نہیں۔ کہ شروع تھا درمیان یا پھر آخر۔۔۔۔اس کو صرف مہینہ یاد ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب شاعر کی نسیانی سے تنگ تھا۔ اور یہی وجہ بنی اس کے چھوڑ کر جانے کی۔ شعر کے الفاظ سے اندازہ ہو رہا ہے کہ شاعر کو بھی کوئی دکھ نہیں ہے۔

یوں پلکیں بھیگتی رہتی ہیں جیسے

میری آنکھوں میں آ ٹھہرا دسمبر

اب شاعر نے یکدم پلٹی کھائی ہے۔ اور محبوب کے ذکر سے سیدھا غم روزگار پر آ پہنچا ہے۔ شاعر کسی ہوٹل میں پیاز کاٹنے کے فرائض سر انجام دے رہا ہے۔ اور انکی وجہ سے جو آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے اس کو بھی دسمبر کے سر تھوپ دیا۔ حالانکہ دسمبر اک خوشیوں بھرا مہینہ ہے۔ اور خاص طور پر مغربی ممالک کے لیئے خوشیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ مگر اسے شاعر کی مغرب بیزاری کہیں یا پھر دسمبر سے چڑ کے اس نے پورے دسمبر کو ہی نوحہ کناں قرار دے دیا ہے۔

جمع پونجی یہی ہے عمر بھر کی

مری تنہائی اور میرا دسمبر

شاعر اک فضول خرچ آدمی ہے یا پھر بے روزگار۔ کہ اس کے پاس تنہائی کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں۔ اوپر سے اس نے اس کڑکی کے دور میں جب کچھ اور ہاتھ آتا نہ دیکھا تو دسمبر کو ہی اپنی ملکیت قرار دے دیا۔ دسمبر نے یقینا اس دعوے پر اچھے بھلے ناشائستہ لہجے میں اظہار خیال کیا ہوگا۔ واللہ اعلم

اک اور وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر اک بدزبان آدمی تھا۔ اور اسی وجہ سے کوئی بھی اس سے ملنا یا بات کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ اب تنہائی میں بیٹھا اکیلے میں باتیں کرتے ہوئے دسمبر کو کہنے لگا کہ یار تم تو میرے ہو۔ سنا ہے دسمبر نے اسکا دل رکھنے کو حامی بھر لی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دسمبر نے صاف انکار کر دیا تھا۔ خیر ہم اندر کی تفصیلات میں نہیں جاتے۔

"دراصل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دسمبر کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟؟؟؟"

دسمبر کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ شاعر کے ساتھ ہے جس نے دسمبر کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور آخر میں اسے اک تھپکی بھی دے کہ

"تو تو یار ہے اپنا۔ فکر مت کر۔۔۔"

غیر تصدیقی ذرائع سے یہ بھی سننے کو ملا ہے کہ دسمبر اس کے خلاف احتجاج کرے گا۔ اور قانونی چارہ جوئی کے لیئے بھی کوئی دعوی دائر کرے گا۔

اے موسمِ خزاں الوداع۔۔۔۔۔

دسمبر اب جو جاو تم

کرن مہک

دسمبر جارہاہے۔دوستوں آئیں مل کر دعا کرتے ہیں کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے خیر و عافیت اور خوشیوں میں کشادگی اور ہماری زندگی میں رحمتیں برکتیں لے کر آئے۔اور اپنے ساتھ تمام وبائی امراض خاص طور پے کرونا وبا کو اپنے ساتھ ایسی مقام پے لے جائے جہاں واپسی کے راستے نہیں ہوتے

دو ہزار بیس نے ابن آدم کو موت کا کتنا گھناونا روپ دیکھایا ہے۔۔ایسا روپ جسے انسانی زھن اس جدید دور میں تصور نہیں کر سکتا تھا یہ وہ قدیم دور تو نہیں جس میں کرونا نام کی وبا طاعون بیماری کی طرح انسانوں کو نگل جاتا۔ کرونا نے تو انسان کو انسان سے ہی خوفزدہ کیا بلکہ پوری دنیا کی کاروبار زندگی کو مفلوج کیا۔۔

موجودہ دور میں اتنی ترقی ہو چکی ہے کہ آج ہر اس بیماری کا علاج ممکن ہے جسے گزشتہ صدریوں میں طاعون کا نام دیا جاتا تھا اگر نا ممکن بھی ہے تو بیماری کو ادویات کی مدد سے کنٹرول کر کے انسان ایک نارمل زندگی گزار سکتا ہے۔۔آج کا انسان رات کو روشن کر چکا ہے۔۔اور اس مصنوعی روشنی میں وہ اپنی پرانی اقدار کو بلائے طاق رکھ چکا ہے۔بس نفاق ریاکاری کے علاج کی کھوج نا کر سکا ۔۔نیتوں کی خرابی نے کرونا وبا کو زندگی دی۔۔جس نے ایک شہر ایک ملک کو ہی نہیں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔رستے سنسان ہوئے لوگ اپنے ہی گھروں میں محسور رہے۔۔انسان انسان کے لیے اچھوت بن گیا۔۔

دو ہزار بیس کا یہ پورا سال پوری دنیا کے لیے وبائی سال ٹھہرا جس نے انسان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور خواہشوں کو نگل لیا ۔حضرت انسان کو احساس دلایا کہ انسان چاہے کتنی ہی ترقی یافتہ دور میں داخل ہو جائے رب کائینات کے سامنے بے بس ہے۔ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک کے لوگ رب کے سامنے سجدہ زیر ہوتے نظر آئے۔۔ہماری مسجدیں ویران کر دی گئ۔۔یہاں تک کہ حرم کعبہ کا طواف عبادتیں روک دی گئ۔۔یہ منظر دیکھنا بھی بحثیت مسلمان قیامت سے کم تو نہیں تھا۔۔

دوہزار اکیس کا سورج طلوع ہونے کو ہے۔آئیں دسمبر کو خوشی خوشی الوداع کہیں اور اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ آنے والا سال ہمارے لئے خیر و برکت کی سوغات لے کر آئے۔آمین

کرن مہک

حصہ دوئم

اشعار

منتخب اشعار:

خارِ چمن تھے شبنم شبنم پھول بھی سارے گیلے تھے
شاخ سے ٹوٹ کے گرنے والے پتے پھر بھی پیلے تھے

سرد ہواؤں سے تو تھے ساحل کی ریت کے یارانے
لو کے تھپیڑے سہنے والے صحراؤں کے ٹیلے تھے
غلام محمد قاصر

بچھڑ گیا تو پھر اس یارِ خوش جمال کے بعد
کسی سے جی نہ لگا اتنے ماہ و سال کے بعد
صفدر صدیق رضی

اک عمر دو گھڑی میں محبت کی کٹ گئی
بچھڑے تو ایک سال بڑی دیر تک رہا
علی مزمل

اک مرے خونِ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں

اے نئے سال ! ترے پاس نیا کچھ بھی نہیں

وہی بے مہر شب و روز، وہی اندیشے

سالِ نو، وعدہء فردا کے سوا، کچھ بھی نہیں

ناصر بشیر

ہر اک طرف تھی ہمکلام، بس خزاں کی زرد شام

کہ اس نے جب ہتھیلیوں سے پھول بھی اٹھا لیے

جناب ایاز محمود ایاز

کہو تو تم کو سناؤں نوید فصلِ بہار ؟

مگر نہیں، ابھی مضبوط ہیں خزاں کے قدم

ناصر بشیر

چادریں ان کو میسر ھیں مگر مجھ کو نہیں

میں تو سردی میں مزاروں کی طرف دیکھتا ھوں

عاصم تنہا

آنچ تو دیئے کی تھی سردیوں کی شاموں میں

ورنہ دھوپ کب اتری سردیوں کی شاموں میں

محترمہ فرحت زاہد

ہاتھ سے کبوتر تو پھر اڑا دیا میں نے

رہ گئی ہے تنہائی سردیوں کی شاموں میں

محترمہ فرحت زاہد

دسمبر ہی تو ہے محبتوں میں بہار کا موسم

بارش کی روانی اور قرار کا موسم

راجہ حماد سرفراز

شام کو آنے میں تاخیر نہ کیا کیجئے

یہ ہے رات کے ڈھلنے میں تیز رفتار کا موسم

راجہ حماد سرفراز

بھیگے بھیگے سے مہہ و سال کہاں

تو کہاں اب ترا خیال کہاں ؟

محترمہ افروز رضوی

یہ اٹھتی ہیں جو ٹیسیں، ٹھنڈے سے اس موسم میں

ماضی میں جھانک کے دیکھو، کوئی چوٹ پرانی ہو گی

سید ضیاء حسین

ہم نے کہا کہ وصل ہو، عرصہ ءِ ماہ و سال میں

اُس نے کہا کہ شوق سے، ملتے رہو خیال میں

یُسریٰ وِصال

کھو گئی یاد بھی گزرے ہوئے سالوں میں کہیں

رہ گیا نام ترا میرے مقالوں میں کہیں

محترمہ پریا تابیتا

کہیں سورج نظر آتا نہیں ھے

حکومت شہر میں اب دھند کی ھے

عاصم تنہا

وہ پہلو میں اگر میرے نہیں ہے

تو یہ موسم سہانا ہے عبث

اسد رضا سحر

کبھی فصل گل کا حسیں سماں کبھی سردیوں کی اداس شب

تھیں محبتوں پہ جوانیاں مرے ہم سفر مرے ہم نفس

محترمہ نیر رانی شفق

کھو گئی یاد بھی گزرے ہوئے سالوں میں کہیں

رہ گیا نام ترا میرے مقالوں میں کہیں

محترمہ پریا تابیتا

ترے لہجے کا ہر موسم یوں مجھ میں جذب ہوتا ہے
خزاں موسم سے مر جھاتی بہاروں میں نکھرتی ہوں

جو بارش ہو محبت کی مرا من بھیگ جاتا ہے
ہوا تلخی کی چلتی ہے تو خود سے بھی الجھتی ہوں
حمیرا قریشی

اس بار دسمبر میں ملاقات کریں گے
سوچا ہے صنم تم سے ہر اک بات کریں گے

ہاتھوں میں دیئے ہاتھ بہت دور چلیں گے
دل چیز ہے کیا جاں تمہیں سوغات کریں گے
ڈاکٹر لبنیٰ عکس

سرما کی راتوں میں آتش دان کے پاس
دیکھ تو کیسے دہک رہی ہے تیری یاد
زاہد شمسی

وہ سردیوں کی کسی سرد رات کی بارش

تمہاری آنکھ سے ٹپکی تو پھر شراب بنی

زاہد شمسی

رد مہری میں پیار کی باتیں

برف میں آگ کا تماشہ ہے

زاہد شمسی

اس دسمبر کی خشک سردی میں

روح جلتی ہے جسم ٹھنڈا ہے

زاہد شمسی

ملا وہ یوں گلے لگ کر شب وعدہ
نومبر میں پسینہ آگیا ھم کو
عابد علیم سھو

پتوں نے ساتھ چھوڑا تو شاخوں کی شکل میں
چاروں طرف سے پیڑ کے بازو نکل پڑے
الماس شبی

اندر کی برف بھر گئی انگھٹیوں میں راکھ
ہاتھوں نے سرخ آگ کی حدت نکال لی
سلیم فگار

برف گرتی ہے تو پھر یاد مجھے آتا ہے
میرے خوں میں بھی کبھی آگ جلا کرتی تھی
سلیم فگار

دسمبر راہ میں ھے اور دل پر
ابھی سے برفباری ھو رہی ہے
سلیم فگار

اس بار میں نے صورتِ حالات میں دل کو
پتوں کی طرح آنکھوں سے جھڑتے ہوئے دیکھا

کٹتی ہوئی شاخوں کی عزاداری میں تم نے
سہمے ہوئے پیڑوں کو سسکتے ہوئے دیکھا؟

سلیم فگار

ترا پیام کیا ملا فصلِ خزاں میں بھی مرے
دل کی اداس شاخ پر جیسے گلاب آ گئے
سلیم فگار

اترا ہے میری سوختہ شاخوں پہ اب کے بور
صدیوں کے بعد صحن کے بوٹے ہرے ہوئے
سلیم فگار

اسے کہنا خزاں کے موسموں میں
اداسی گفتگو کرتی ہے مجھ سے
سلیم فگار

دسمبر کا یہ سورج شام کی ڈھلتی ہوئی کرنیں
یہ تنہائی تو جیسے میرا سینہ چاک کر دے گی
سلیم فگار

دیکھ کر حسن کی فراوانی

ایک چولہے پہ رکھ دیا پانی

جسم تیرا مری پناہ میں تھا

شوق زندہ، ہوا تھی برفانی

جناب کامران نذیر

اُجاڑ موسم میں ریت دھرتی پہ فصل بوئی تھی چاندنی کی
اب اُس میں اُگنے لگے اندھیرے تو کیسا جی میں ملال رکھنا
اعزاز احمد آذر

انھیں کے واسطے پت جھڑ میں پھول کھلتے ہیں

اُداسی–وں میں بھی جو مسک-را کے ملتے ہیں

شاہِدہ مجید

دُھند پھیلے گی اُداسی کی ابھی دُور تلک

ہِجر کی رُت ہے جِسے فصلِ زمستاں کہیے

شاہِدہ مجید

پڑے ہیں رنگ پھیکے شام کے گہرے ہوئے سائے

دسمبر جا رہا ہے اور تم اب تک نہیں آئے

آئرین فطرت

خیر مجھ کو جو پکارے کبھی باہر کی طرف

اپنے اندر کے ہر اک شر سے نکل جاؤں میں

جسم زنداں ہی سہی، سوچ مگر بارہ دری

جس طرف چاہوں کسی در سے نکل جاؤں میں

شاعرہ نیلم ملک

یہ جدائی تو بہت مشکل ہے

میرے ہمدم ترے وصال کے بعد

سال گذرا ہے سال گذرے گا

تم تو آؤ گے ایک سال کے بعد

شاعر: میاں وقارالاسلام

حصہ سوئم

غزلیں

بے درد دسمبر کبھی مرہم نہیں رکھتا
آنکھوں سے برستا ہے جو پر نم نہیں رکھتا

رکھتا ہے بہت چبھتے ہوئے یادوں کے نشتر
پر سرحدوں کی دل کے یہ مقدم نہیں رکھتا

بھرپور جلاتا ہے سلگنے نہیں دیتا
کیا برسے گا پھولوں پہ جو شبنم نہیں رکھتا

وہ سخت تھا اتنا کہ مجھے توڑ ہی ڈالا
اس جیسا تو لہجہ کوئی برہم نہیں رکھتا

ہم اپنی محبت کا کریں کیسے گھر آباد
بکھرا ہوا ساماں کوئی ہمدم نہیں رکھتا

اس کو یہ گماں ہے کہ اسے بھول گئے پر
ہر بار دسمبر مجھے بے غم نہیں رکھتا

آتا ہے دسمبر تو یہ خالی نہیں جاتا
کرتا ہے جدا افش یہ باہم نہیں رکھتا

افشاں افش

دسمبر جب بھی آتا ہے مہرباں یاد آتے ہیں۔۔۔۔
کےٗ تھے جو بھی گرمی نے ستم وہ بھول جاتے ہیں۔۔۔

سلگ اٹھتے ہیں جذبے سردیوں کی برف باری سے۔۔۔
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں ہمسفر کو بیقراری سے۔۔۔

خزاں کی آہٹیں سُن کر بہاریں لوٹ جاتی ہیں۔۔
گرا کر خشک پتوں کو ہوائی یں مسکراتی ہیں۔۔

دسمبر کا مہینہ تو خزاں کو ساتھ لاتا ہے۔۔۔
نہ جانے کیوں یہی موسم ہمارے دل کو بھاتا ہے۔۔

ہمیشہ گرم موسم میں بہاریں مسکراتی ہیں۔۔۔
مہکتی ہیں فضائی یں اور فصلیں لہلہاتی ہیں۔۔۔

بظاہر تو مرے اندر کا موسم ایک جیسا ہے۔۔۔
کوئی جھانکے اگر دل میں تو دیکھے درد کیسا ہے۔۔۔

اگر اے مہ جبیں اندر کا موسم خوشنما ہو گا۔۔۔
پرندہ دل کا پھر باہر کے موسم پر فدا ہو گا۔۔

شاعرہ: مہ جبین ملک

اس بار دسمبر میں ملاقات کریں گے
تم سے ہی صنم سوچا ہے ہر بات کریں گے

ہاتھوں میں دے کے ہاتھ بہت دور ہے چلنا
دل چیز ہے کیا جاں تمہیں سوغات کریں گے

کاندھے پہ سیاہ شال مری خوب جچے گی
جاناں تری باہنوں میں ہی اب رات کریں گے

تھک ہار گئے سن کے دسمبر کی اداسی
وحشت ہٹا کے پیار کی برسات کریں گے

لگنے نہ دیں گے پیار کو اب کوئی نظر بد
صدقہ بھی کریں گے ذرا خیرات کریں گے

دیوانہ بنا دیتی ہے انساں کو محبت
اچھا ہے یہی ترکِ ملاقات کریں گے

ہونی ہو لکھی ٹلتی نہیں وہ کسی صورت
ہم تجھ سے وفا گردشِ حالات کریں گے

اب کاٹتی ہے عکس ہمیں یہ شبِ فرقت
جب کوئی نہیں خود سے ہی ہم بات کریں گے

ڈاکٹر لبنیٰ عکس

آج پھر دل میں بسایا ہے خزاں کا موسم
میرے اس شہر بھی آیا ہے خزاں کا موسم

میرے چہرے پہ جو زردی سی نظر آتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ چھایا ہے خزاں کا موسم

بڑی بے چین سی لگتی تھیں بہاریں مجھ کو
ان کی خواہش پہ تو آیا ہے خزاں کا موسم

دشت تنہائی میں بس چھپ کے ہی رو لیتی ہوں
میں نے تم سے بھی چھپایا ہے خزاں کا موسم

عکسِ یادوں کو جلانا چلو آسان ہوا
خشک پتے بھی تو لایا ہے خزاں کا موسم

ڈاکٹر لبنیٰ سلمان

جب عشق کی حدت سے یہ جھلسا تھا مرا دل

ہونٹوں کی شرارت نے مجھے آگ لگا دی

اللہ نے مجھے بخشا گنہگار سمجھ کر

لوگوں کی حقارت نے مجھے آگ لگا دی

میں تو انہیں توحید کا دیتا ہی رہا درس

مشرک کی رقابت نے مجھے آگ لگا دی

اندر کے شراروں کی خبر مجھ کو نہیں تھی

طوفاں کی بشارت نے مجھے آگ لگا دی

پت جھڑ کے تھپیڑوں نے تھے خاشاک سمیٹے

جذبوں کی حرارت نے مجھے آگ لگا دی

میاں وقارالاسلام

نہ پوچھ کرب نہاں کتنے میری آہ میں ہیں

وہ تیرے ہجر کے لمحے مری نگاہ میں ہیں

وگرنہ شہر کی رونق میں کھو گئے ہوتے

ہزار شکر کہ ہم لوگ بھی پناہ میں ہیں

اجاڑ کر بھی مرے دل کو وہ مٹا نہ سکا

ہزاروں خواہشیں اب بھی دلِ تباہ میں ہیں

ترے عروج میں شامل مری وفا کے نشاں

جگہ جگہ سے نمایاں تری کلاہ میں ہیں

مری حیات کے لمحے بھی اے مرے ہمدم

ہے کیا غضب کہ یہ غیروں کی خیمہ گاہ میں ہیں

جو مجھ کو چھوڑ کے جاوء تو سوچ لو یہ صنم

حسین لوگ ہزاروں ہی میری راہ میں ہیں

مرے عدو تو مجھے اتنا بے خبر نہ سمجھ

ترے تمام ٹھکانے مری نگاہ میں ہیں

! قدم قدم پہ مجھے اپنی مات کیوں نہ لگے

مرے مزاج کے دشمن مری سپاہ میں ہیں

اقبال شاہ

خزاں کے پاؤں تلے غنچہ و ثمر سے دور
جو شاخ ٹوٹ گئی ہو گئی شجر سے دور

کوئی پرندہ ٹھکانہ تلاش کرتا ہے
اور ایک ہم کہ رہے ساری عمر گھر سے دور

تری اُداسی ہمیں زنگ کرتی جاتی ہے
تمام رنگ یہ کہہ کر ہوئے سحر سے دور

عجیب طرح کی زنجیرِ وعدہ پاؤں میں تھی
سفر پسند مسافر رہا سفر سے دور

جو دکھ ملے تو کوئی آسرا نہیں ملتا
کنارا ہوتا ہے اکثر یہاں بھنور سے دور

میں گردِ رہ کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ تھا شاذ

بڑے جتن سے ہوا وہ مری نظر سے دور

شجاع شاذ

ہر خزاں کو بہار کرتی ہوں

اس طرح تجھ کو پیار کرتی ہوں

ہے ندامت لہو نہ رو پائی

دل کو خوں بار بار کرتی ہوں

رونقیں جس سے دل کی بڑھ پائیں

دُکھ وہی یادگار کرتی ہوں

راہ غم کی ہے خود ہی طے کرنی

کیوں ترا انتظار کرتی ہوں

دلِ ناہید کی بساط ہے کیا

'جان تم پر نثار کرتی ہوں'

ناہید ورک

کبھی سمجھ میں نہ آئیں گی چاہتیں میری

مگر یہ دھیان میں رکھنا محبتیں میری

تم اِس کو نام دے دینا مری محبت کا

کہ خود میں پاؤ گے اکثر شباہتیں میری

رفاقتیں مری آباد تم کو رکھیں گی

یہ صرف یاد نہیں، ہیں کرامتیں میری

ترا ہی ذکر مرا دائمی وظیفہ ہے

تری ہی یادیں بنی ہیں ضرورتیں میری

کلی کو اپنے تبسّم سے خوف آتا ہے

ہوئی ہیں جب سے خزاں بار نکہتیں میری

میں اُسکو سوچ کے خوش ہوں تو ملنے پر ناہید
مجھے سنبھال نہ پائیں گی حسرتیں میری

ناہید ورک

روز و شب اک ایک پل زخمِ جُدائی دیکھئے

آرزو کے ساتھ دردِ نارسائی دیکھئے

وقت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر یاد کا

دائرہ در دائرہ کاٹے گا کائی دیکھئے

میرا لہجہ ہے خزاں آثار، دل خاموش ہے

گلشنِ ہستی میں میری کم نوائی دیکھیئے

وہ اگر سورج ہے اُسکی دھوپ بن جاؤں گی میں

مجھ میں بھی یعنی وہی جلوہ نمائی دیکھئے

عشق کی جلوہ گری کے واسطے کم ہے یہ دہر

اک جہانِ تازہ کیا ساری خدائی دیکھیئے

ناہید ورک

دل و نگاہ کے حسن و قرار کا موسم
وہ تیری یاد ترے انتظار کا موسم

جھکی ہے آنکھ کئی رت جگے سمیٹے ہوئے
چھپا ہے لمس میں کیسا خمار کا موسم

ہمارے پیار نے عمرِ دوام مانگی ہے
ہمیں قبول نہیں تھا اُدھار کا موسم

فراق لمحوں کو ہم نے حسیں بنایا ہے
سجا کے دِل میں ترے اعتبار کا موسم

ملی نگاہ تو اِک پل میں ہم پہ گزرا ہے
کروڑ قربتوں لاکھوں قرار کا موسم

ہمارے پیار کی یہ بھی ادا نرالی ہے

خزاں کی رُت میں منایا بہار کا موسم

شازیہ اکبر

شام خزاں کی گم صم بولی

جیون لمحے زہر کی گولی

میرے آنسو اور ستارے

کھیل رہے ہیں آنکھ مچولی

دو پھولوں کی خاطر ترسیں

آج بہاروں کے ہمجولی

چاند کا سایہ چھت سے اترا

ہمسائے نے کھڑکی کھولی

توڑ دیا دم دیوانوں نے

عمر جنوں کی پوری ہولی

پھول بھی ہے وہ کانٹا بھی ہے

من میلا ہے صورت بھولی

لمبی ہے تقدیر کی ڈوری
کس نے ناپی کس نے تولی

اپنی دنیا رین بسیرا
اپنی دولت خالی جھولی

جسم کا زنداں روزن روزن
جب بھی چاہا سوئی چبھو لی

میرے شعروں کا مجموعہ
مست خراموں کی اک ٹولی

خاکِ درِ میخانہ ہم نے
ساقی پیمانوں میں گھولی

پتے بھی اشجار کے نغمے
سائے ہیں دیوار کی بولی

چھینٹ غمِ عصیاں کی ساغر

ہم نے شرابِ ناب میں دھو لی

ساغر صدیقی

کلینڈر پھر پلٹتا ہے دسمبر پھر بدلتا ہے
دعا پھر چار سو میرے نیا منظر ابھرتا ہے

گھٹا جب چھٹنے لگتی ہے گھٹا کی اوٹ سے یکدم
فلک پر سرد موسم میں حسیں سورج نکلتا ہے

محبت نے کہا مجھ سے محبت کے لیے پھر سے
تعلق تازہ کرنے کو میرا دل بھی مچلتا ہے

مرے دل کو تمہیں نے برف کا ٹکڑا کہا تھا ناں
وہی ٹکڑا محبت کی حرارت سے پگھلتا ہے

یہ درد و رنج آنکھوں کا بہا دو اپنے اشکوں میں
تمہارے پیار سے دلبر یہ میرا دل بہلتا ہے

دعا علی

وہی شورش موئے پر بھی ہے اب تک ساتھ یاں میرے

ہما کے آشیانے میں جلیں ہیں استخواں میرے

عزیزاں غم میں اپنے یوسفؑ گم گشتہ کے ہر دم

چلے جاتے ہیں آنسو کارواں در کارواں میرے

تمھاری دشمنی ہم دوستوں سے لانہایت ہے

وگرنہ انتہا کینے کو بھی ہے مہرباں میرے

لب و لہجہ غزل خوانی کا کس کو آج کل ایسا

گھڑی بھر کو ہوئے مرغ چمن ہم داستاں میرے

نظرمت بے پری پر کر کہ آں سوے جہاں پھر ہوں

ہوئے پرواز کے قابل یہ ٹوٹے پر جہاں میرے

کہاں تک سر کو دیواروں سے یوں مارا کرے کوئی

رکھوں اس در پہ پیشانی نصیب ایسے کہاں میرے

مجھے پامال کر یکساں کیا ہے خاک سے تو بھی

وہی رہتا ہے صبح و شام در پے آسماں میرے

خزاں کی باؤ سے حضرت میں گلشن کے تطاول تھا

تبرک ہو گئے یک دست خار آشیاں میرے

کہا میں شوق میں طفلان تہ بازار کے کیا کیا

سخن مشتاق ہیں اب شہر کے پیر و جواں میرے

زمیں سر پر اٹھالی کبک نے رفتار رنگیں سے

خراماں ناز سے ہو تو بھی اے سرو رواں میرے

سخن کیا میر کریے حسرت و اندوہ و حرماں سے

بیاں حاجت نہیں حالات ہیں سارے عیاں میرے

میر تقی میر

وہ مور پنکھ سے ہر زخم جھلنے جائے گا

سلگتی آگ سے زندہ نکلنے جائے گا

رکی رکی ہے پتنگوں کی سانس آج کی رات

تھرکتی شمع پہ اب کون، جلنے جائے گا

دلوں کے سب در و دیوار توڑ کر یہ وقت

محل کو اور کھنڈر میں بدلنے جائے گا

خزاں جب آئے گی، تو پھول پھول کا جوبن

کہاں بہار کے سانچے میں ڈھلنے جائے گا

ہمیں کو آگ لگا کے، چلا گیا ہے کہیں

کہا تھا جس نے مرے ساتھ جلنے جائے گا

تمام چاند ستاروں کے دن معین ہیں

اندھیرا ان کو بھی آخر نگلنے جائے گا

بہت دنوں سے یہ آنسو رکے تھے نیناں میں

سمندر آج، نگینے اگلنے جائے گا

فرزانہ نیناں

میں اِک شیشہ تھا، پتھر ہو گیا ہوں

تعجب ہے کہ کیوں کر ہو گیا ہوں

غبارِ جاں سمٹتا ہی نہیں ہے

میں کیا تھا، کیا بکھر کر ہو گیا ہوں

اتر کر زینۂ خوابِ مقفّل

خود اپنے گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں

بچھڑ کر تجھ سے اے رشکِ گلِ تر

خزاں کا خاص منظر ہو گیا ہوں

ترے آنچل کی خوشبو اوڑھ کر میں

مقدر کا سکندر ہو گیا ہوں

چراغِ لمس کی لَو ہی بہت ہے

میں اُن پوروں کو ازبر ہو گیا ہوں

ابھی کچھ دن سنبھلنے میں لگیں گے

مگر پہلے سے بہتر ہو گیا ہوں

میں اُن آنکھوں کا نم پی پی کے خاور

بجائے خود سمندر ہو گیا ہوں

ایوب خاور

اُلجھنوں میں پڑا نہیں تھا مَیں

اُس سے جب تک لڑا نہیں تھا مَیں

خود بخود گر گئے سبھی ورنہ

اس نگر میں بڑا نہیں تھا مَیں

اُس کو پانے کی ضد بھی تھی میری

اور ضد پر اَڑا نہیں تھا مَیں

پوچھ لیتا وہ حالِ دل میرا

بے سبب تو کھڑا نہیں تھا مَیں

پانیوں کا مزاج بدلا تھا

ورنہ کچا گھڑا نہیں تھا مَیں

اُس خزاں کو بھی معتبر جانا

جس خزاں میں جھڑا نہیں تھا مَیں

بٹ گئے لوگ جا بجا لیکن

ان دھڑوں میں دھڑا نہیں تھا مَیں

دل کو خدشہ نہ تھا کوئی ناصر

جب کہیں بھی جڑا نہیں تھا مَیں

ناصر ملک

مکاں کے ہوتے ہوئے بھی جو لامکاں کوئی ہے

تو پھر یقین و گماں کے بھی درمیاں کوئی ہے

اسے تھا زعم کہ مجھ سا نہیں کہیں کوئی

پھر ایک دن وہی کہنے لگا کہ ہاں، کوئی ہے

نہ زندگی کو نہ خود کو ہی میں سمجھ پایا

سو داستاں کے علاوہ بھی داستاں کوئی ہے

تو بات، بات پہ اپنا بیاں بدلتا ہے

جسے میں آخری سمجھوں، ترا بیاں کوئی ہے؟

. ! تمام دوست مجھے اہلِ علم لگتے ہیں

سمجھ سکے جو مری داستاں یہاں کوئی ہے؟

یہ کیا کہ اب تو ترے خواب تک نہیں آتے

سو فصلِ گل ہے مجھے اب، نہ اب خزاں کوئی ہے

زیاں تو ہوتا ہے لیکن زیاں نہیں لگتا

اب اس سے بڑھ کے بھلااور بھی زیاں کوئی ہے؟

تمام عمر گزاری ہے امتحاں جیسی

سنا ہے اس کے علاوہ بھی امتحاں کوئی ہے

میں چل کے آگ پہ سب کو دکھا چکا پھر بھی

میں کیا کہوں، اگر اب بھی جو بد گماں کوئی ہے

نجانے وجد میں مجھ سے یہ کون کہہ رہا تھا

! جہاں نہیں ہے اگر کوئی بھی، وہاں کوئی ہے

صغیر بارہا میں خود پہ وار کرتا ہوں

مجھے جو مجھ سے بچاتا ہے مہرباں کوئی ہے

صغیر احمد صغیر

یہی بہت ہے کہ محفل میں ہم نشیں کوئی ہے

کہ شب ڈھلے تو سَحر تک کوئی نہیں، کوئی ہے

نہ کوئی چاپ نہ سایہ کوئی نہ سرگوشی

مگر یہ دل کہ بضد ہے، نہیں نہیں کوئی ہے

ہر اک زباں پہ اپنے لہو کے ذائقے ہیں

نہ کوئی زہرِ ہلاہل نہ انگبیں کوئی ہے

بھلا لگا ہے ہمیں عاشقوں کا پہناوا

نہ کوئی جیب سلامت نہ آستیں کوئی ہے

دیارِ دل کا مسافر کہاں سے آیا ہے

خبر نہیں مگر اک شخص بہتریں کوئی ہے

یہ ہست و بود یہ بود و نبود وہم ہے سب

جہاں جہاں بھی کوئی تھا وہیں وہیں کوئی ہے

فرازؔ اتنی بھی ویراں نہیں مری دنیا
خزاں میں بھی گُلِ خنداں کہیں کہیں کوئی ہے

احمد فراز

جب سے کتاب زیست کا رنگ جمال ہیں
تب سے خود اپنی ذات میں محو دھمال ہیں

ساری رُتیں سما گئیں آنکھوں کے درمیاں
جیسے خزاں کے ماتھے پہ برکھا کا جال ہیں

کیسے طلب کے خواب ہیں اب تک نگاہ میں
پلکوں کے اِس دریچے پہ رکھا خیال ہیں

پھر کیا عجب تمنا کے نشتر بدن پہ تھے
دیکھا! جنونِ عشق سے ھم مالا مال ہیں

جب سے خطِ شکستہ میں لکھے گئے ہیں ھم
سارے جہاں کے واسطے کارِ محال ہیں

منزل کی دُھن میں وقت سے آگے نکل گئے
یہ کیسی تشنگی تھی کہ لمحے نڈھال ہیں

کوئی بھی خواب دے نہ سکا آج تک جواب

آنکھوں میں اپنی ایسے کنول کچھ سوال ہیں

آسناتھ کنول

دروازے پر قفل پڑا ہے

کون اس پر دستک دیتا ہے

تنہائی ہے تیز ہوا ہے

میرا غم سوکھا پتا ہے

دور تلک پھیلا یہ صحرا

کس کا رستہ دیکھ رہا ہے

رستے سے کچھ دور بسی اک

تنہائی کی محل سرا ہے

تیری یاد وہاں بکھری تھی

میرا درد یہاں پھیلا ہے

پیچھے زخموں کا جنگل تھا

آگے خون کا اک دریا ہے

پھول خزاں میں مرجھاتے ہیں

میرے دل کا پات ہرا ہے

چونک گئی ہوں جیسے سچ مچ

میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے

لمس تیرا نہ کہیں کھو جائے

مٹھی کھولتے ڈر لگتا ہے

اب تو کسی کا آنا مشکل

آدھی رات ہے، سرد ہوا ہے

ثمینہ راجہ

خوشبو کے ساتھ اس کی رفاقت عجیب تھی

لمس ہوائے شام کی راحت عجیب تھی

چشم شب فراق میں ٹھہری ہے آج تک

وہ ماہتاب عشق کی ساعت عجیب تھی

آساں نہیں تھا تجھ سے جدائی کا فیصلہ

پر مستقل وصال کی وحشت عجیب تھی

لپٹا ہوا تھا ذہن سے اک کاسنی خیال

اترا تو جان و جسم کی رنگت عجیب تھی

اک شہر آرزو سے کسی دشت غم تلک

دل جا چکا تھا اور یہ ہجرت عجیب تھی

ملنے کی آرزو، نہ بچھڑنے کا کچھ ملال

ہم کو اس آدمی سے محبت عجیب تھی

آنکھیں ستارہ ساز تھیں باتیں کرشمہ ساز
اس یار سادہ رو کی طبیعت عجیب تھی

گزرا تھا ایک بار، ہوائے خزاں کے بعد
اور موجۂ وصال کی حدّت عجیب تھی

ششدر تھیں سب ذہانتیں اور گنگ سب جواب
اس بے سوال آنکھ کی وحشت عجیب تھی

اس بار دل کو خوب لگا موت کا خیال
اس بار دردِ ہجر کی شدّت عجیب تھی

ثمینہ راجہ

ہائے وہ بھی حسیں دسمبر تھا

اے مری دلنشیں دسمبر تھا

آگ جسموں میں تھی دھکتی ہوئی

آفریں........آفریں....دسمبر تھا

.برف الفاظ ہو گئے تھے مرے

جل رہی تھی زمیں دسمبر تھا

آتشِ قرب.......چاٹتی......کیسے

میرے دل میں مکیں دسمبر تھا

سر پہ تھا آگ جون کا سورج

میرے اندر کہیں دسمبر تھا،

کل تلک جون تھا جہاں عاصم

آج دیکھا وہیں دسمبر تھا

عاصم تنہا

نومبر گیا اور آیا دسمبر

کہ ساتھ اپنے سردی ہے لایا دسمبر

عجب ہم بھی ہیں چین ہم کو نہیں ہے

تھے سب منتظر کیوں نہ آیا دسمبر

پڑی تھی یہ موسم کی گرمی بلا کی

دیا رب نے پھل کیسا چھایا دسمبر

سبھی ماہ ہوتے ہیں موسم کے یکساں

مگر سب کے دل سے ہے بھایا دسمبر

شگفتہ اگر بات دل کی جو پوچھو

تو سمجھو کہ میں نے بلایا دسمبر

شگفتہ ناز

یہ جدائی تو بہت مشکل ہے

میرے ہمدم ترے وصال کے بعد

سال گذرا ہے سال گذرے گا

تم تو آؤ گے ایک سال کے بعد

میری آنکھیں تو بھیگ جاتی ہیں

پھر سے تیرے حسیں خیال کے بعد

دوستی کی مثال کیسے دوں

میرے ہمدم تری مثال کے بعد

میرے سارے جواب ہار گئے

ترے اک لاجواب سوال کے بعد

شاعر: میاں وقار الاسلام

وہی تھے جو اپنی جستجو میں کھرے نہیں تھے

وگرنہ ہم اُن کی دسترس سے پرے نہیں تھے

تبھی وہ سمجھے کہ ہم کھلونے نہیں ہیں جب ہم

وہاں سے اُن کو ملے جہاں پر دھرے نہیں تھے

درخت پھر سے ہرا، پھلوں سے بھرا ہوا ہے

!مگر وہ پتے، بہار میں جو ہرے نہیں تھے

اُس ایک لمحے کا رنگ عمروں پہ چھا گیا ہے

وہ ایک لمحہ کہ رنگ جس میں بھرے نہیں تھے

شاعرہ نیلم ملک

رات پھیلی ہے تیرے سرمئی آنچل کی طرح

چاند نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح

خشک پتوں کی طرح لوگ اڑے جاتے ہیں

شہر بھی اب تو نظر آتا ہے جنگل کی طرح

پھر خیالوں میں ترے قرب کی خوشبو جاگی

پھر برسنے لگی آنکھیں مری بادل کی طرح

بے وفاؤں سے وفا کر کے گزاری ہے حیات

میں برستا رہا ویرانوں میں بادل کی طرح

کلیم عثمانی

دل کے اندر باہر غم

یعنی سات سمندر غم

جب سے اوجھل تیری آنکھ

میری آنکھ کا منظر غم

یاس رتوں کی سرد ہوا
ہر اک سمت دسمبر غم

کر کے سوچوں میں گم صم
کر دیتے ہیں پتھر غم

کب ہوں تنہا ساتھ مرے
تیری یاد کے لشکر غم

دُور اُفق پر تمثیلہ
دیکھا چاند سا پیکر غم

تمثیلہ لطیف

حصہ چہارم

نظمیں

محبت کی دوسری ادھوری نظم

محبت ذات ہوتی ہے
محبت ذات کی تکمیل ہوتی ہے
کوئی جنگل میں جا ٹھہرے، کسی بستی میں بس جائے
محبت ساتھ ہوتی ہے
محبت خوشبوؤں کی لَے
محبت موسموں کا دَھن
محبت آبشاروں کے نکھرتے پانیوں کا مَن
محبت جنگلوں میں رقص کرتی مورنی کا تَن
محبت.برف پڑتی سردیوں میں دھوپ بنتی ہے
محبت چلچلاتے گرم صحراؤں میں ٹھنڈی چھاؤں کی مانند
محبت اجنبی دنیا میں اپنے گاؤں کی مانند
محبت دل
محبت جاں
محبت روح کا درماں

محبت مورتی ہے

اور کبھی جو دل کے مندر میں کہیں پر ٹوٹ جائے تو

محبت کانچ کی گڑیا

فضاؤں میں کسی کے ہاتھ سے گر چھوٹ جائے تو

محبت آبلہ ہے کرب کا

اور پھوٹ جائے تو

محبت روگ ہوتی ہے

محبت سوگ ہوتی ہے

محبت شام ہوتی ہے

محبت رات ہوتی ہے

محبت جھلملاتی آنکھ میں برسات ہوتی ہے

محبت نیند کی رُت میں حسیں خوابوں کے رستوں پر

سُلگتے، جان کو آتے، رتجگوں کی گھات ہوتی ہے

محبت جیت ہوتی ہے

محبت مات ہوتی ہے

محبت ذات ہوتی ہے

فرحت عباس شاہ

سخنور کے نام۔۔۔۔۔۔

اشک کی سبیلوں پر

شام کی فصیلوں پر

درد کے گھنے سائے

جب اترنے لگتے ہیں

زندگی سسکتی ہے

دل تڑپ کے روتا ہے

اس طرح بھی ہوتا ہے

حادثے گزرتے ہیں

سانحے گزرتے ہیں

آرزوؤں کے موتی

ٹوٹ کر بکھرتے ہیں

پھر نہ نیند آتی ہے

پھر نہ کوئی سوتا ہے

اس طرح بھی ہوتا ہے

ایسے درد موسم میں

ایسے سرد موسم میں

ایسے زرد موسم میں

کاروانِ ہستی میں

رنج و غم کی بستی میں

کوئی دلربا ایسا

کوئی آشنا ایسا

دل کے سارے زخموں کو

اپنے نرم لفظوں سے

ایسے مندمل کر دے

منجمد لہو میں جو

اپنے گرم جذبوں کی

جیسے آگ سی بھر دے

زندگی کے آنگن میں

چاندنی سی کھل جائے

جیسے سوختہ جاں کو

زندگی سی مل جائے

تُو ہے چارہ گر ایسا

دل کے بکھرے ٹکڑوں کو

چمن کے جوڑ دیتا ہے

رنج و غم کے طوفاں کا

رخ ہی موڑ دیتا ہے

یوں تو لفظ ہیں سارے

جو قلم نے لکھا ہے

شاعری مگر تیری

زندگی کا قصہ ہے

حرف کے مسیحا سن

درد کے شناسا سن

ہم کو تیرے لفظوں کا

مان رکھنا آتا ہے

لفظ جو کہ حرمت ہیں

لفظ جو صداقت ہیں

لفظ جو کہ نشتر ہیں

لفظ جو کہ مرہم ہیں

لفظ شعبدہ بھی ہیں

لفظ معجزہ بھی ہیں

یہ حسین لفظوں کا معجزہ مبارک ہو

روح تک پہنچنے کا راستہ مبارک ہو

محترمہ نسرین سید

وہی دسمبر کی ہیں سخت سردیاں

تمہارے سوا نہ کچھ دکھائی دے

تمہارے سوا نہ کچھ سنائی دے

وہی صبح تک کے ہیں رت جگے

وہی دن چڑھے کے ہیں دھند لکے

وہی دسمبر کی ہیں سخت سردیاں

وہی انتظار میں ڈوبی گھڑیاں

وہی وصل کی منتظر شامیں

وہی مسافتیں ہیں میرے رُوبرو

وہی منزلیں ہیں میرے ساتھ ساتھ

وہی دسمبر کی ہیں سخت سردیاں

وہی برف میں لپٹی پہاڑیاں

وہی دھند میں لپٹی وادیاں

وہی سانسیں ہیں میرے رُوبرو

وہی دھڑکنیں ہیں میرے ساتھ ساتھ

وہی دسمبر کی ہیں سخت سردیاں

وہی خاموش لبوں کی گفتگو

وہی ان کہی کی بھی جستجو

وہی محبتیں ہیں میرے رُوبرو

وہی چاہتیں ہیں میرے ساتھ ساتھ

وہی دسمبر کی ہیں سخت سردیاں

وہی برف کے اُنچے انبار بھی

وہی برف کی لمبی قطار بھی

وہی مسرتیں ہیں میرے رُوبرو

وہی راحتیں ہیں میرے ساتھ ساتھ

وہی دسمبر کی ہیں سخت سردیاں

شاعر: میاں وقارالاسلام

لامکاں سے ندا آئی

ہیں مکاں تیری آنکھیں

گُلفشاں ہیں تیری آنکھیں

گُلستاں ہیں تیری آنکھیں

یہ نُورِ سحر تیری آنکھیں

یہ شامِ شرر تیری آنکھیں

یہ خُمار آلودہ تیری آنکھیں

یہ جمالِ محشر تیری آنکھیں

نویدِ اُلفت تیری آنکھیں

بریدِ بہشت تیری آنکھیں

مجسمِ محبت تیری آنکھیں

کمالِ معرفت تیری آنکھیں

کبھی جلوت تیری آنکھیں

کبھی خلوت تیری آنکھیں

کبھی کلام کرتی ہوئیں سی

کبھی فطرت تیری آنکھیں

کبھی شراری تیری آنکھیں

کبھی مزاری تیری آنکھیں

دیپ جلاتیں دل مندر میں

راج کُماری تیری آنکھیں

ست بہاری تیری آنکھیں

ہیں اشتہاری تیری آنکھیں

چرا کر گُلشنِ دل سے خوشبُو

ہیں مہکاری تیری آنکھیں

یہ راج دُلاری تیری آنکھیں

یہ مست نظاری تیریؑ آنکھیں

یہ روح تک اُترتی ہوئیں سی

یہ سیاہ کجلاری تیری آنکھیں

کبھی عسرت تیری آنکھیں

کبھی عترت تیری آنکھئں

کبھی رونق تیری آنکھیں

کبھی عبرت تیری آنکھیں

کبھی تیکھن تیری آنکھیں

کبھی اُلجھن تیری آنکھیں

کبھی قدغن تیری آنکھیں

کبھی مدفن تیری آنکھیں

ہیں شرابی تیری آنکھیں

یہ گلابی تیری آنکھیں

کبھی بدمست تیری آنکھیں

کبھی عنابی تیری آنکھیں

ہائے مشہوری تیری آنکھیں

ہائے فطوری تیری آنکھیں

ہائے سروری تیری آنکھیں

ہائے مجبوری تیری آنکھیں

گُلہائے نکہت تیری آنکھیں

ردائے عصمت تیری آنکھیں

جلوہ فگن ہیں امبرِ زیست پر

بنائے گُلدست تیری آنکھیں

کبھی کتابی تیری آنکھیں

کبھی شہابی تیری آنکھیں

کبھی لُٹاتیں خزانہِ درد

عجب شتابی تیری آنکھیں

برستی بُوندیں تیری آنکھیں

برقی کُوندیں تیری آنکھیں

کبھی جگائیں سرد راتوں میں

ہر سُو گوُنجیں تیری آنکھیں

کبھی منادی تیری آنکھیں

کبھی جلادی تیری آنکھیں

پاس آنے سے ڈرتیں مگر

میری عادی تیری آنکھیں

کبھی جلوہ تیری آنکھیں

کبھی پردہ تیری آنکھیں

کبھی گُھنگرُو تیری آنکھیں

کبھی نغمہ تیری آنکھیں

کبھی ہنساتی ہیں تیری آنکھیں

کبھی رُلاتی ہیں تیری آنکھیں

مصروفِ کارِ جہاں ہوں کہیں

مُجھے بُلاتی ہیں تیری آنکھیں

ہیں اضطرابی تیری آنکھیں

ہیں اجتنابی تیری آنکھیں

ہزار ہا سوالات ہیں میرے

بس جوابی ہیں تیری آنکھیں

!!!فیصل ملک

"دسمبر ایسے اُترا ہے"

دسمبر ایسے اُترا ہے
مری آنکھوں کی جھیلوں میں
کہ جیسے زرد سے پتّے
سرِ راہ ٹُوٹ جاتے ہیں
ہوائیں شور کرتی ہیں
جب اُن سے رُوٹھ جاتے ہیں
دسمبر ایسے اُترا ہے
مرے خاموش لفظوں میں
کہ جیسے بھیگتی رُت میں
محبت بھیگ جاتی ہے
کُہر جب ٹُوٹ کے برسے
کسی کی یاد آتی ہے
دسمبر ایسے اُترا ہے
مرے دل کے دریچوں میں
کہ جیسے اجنبی کوئی
تمنّائے تعلُق میں

مجھے آواز دیتا ہے

مگر نہ جب جواب آئے

تو واپس لوٹ جاتا ہے۔

" منزّہ سحر "

!!!!!!!!وہی ھوانا۔۔۔

!!کہا بھی تھانا۔۔۔

نہیں بدلنا

ملے ھو جب تم، تو ساتھ چلنا

میرے قدم سے قدم ملا کر

وہ سارے منظر کو قید کرنا

حقیقتوں پر جو مشتمل ھوں

وہ سوچ رکھنا۔۔وہ خواب بننا

جو میرے دل سے تمھارے دل تک

گزرتی ھے بس، وہ راہ چننا

مگر نا جانے تھے

کس گماں میں

کہ راستوں سے بھٹک گئے ھو

کنارا کرکے تم اپنی کشتی

مجھے بھی دل سے جھٹک گئے ھو

مجھے پسند تھے خزاں کے رنگ اور

تمھیں پسند تھیں بھار و گلشن

یہ موسموں کا ھی فرق تھا۔۔! یا
ھماری سوچوں میں کچھ کمی تھی؟
نا جھیل پائے ہم ان دنوں کو
کہ موسموں میں بس اک نمی تھی
بچھڑنے پر تھا تمھارا دعوا
تمھارے بن میں نا جی سکوں گا
کروں گا میں اتنا یاد تم کو
تمھاری سوچوں میں، میں رھونگا
ان آنسوئں میں تھی اک الجھن
جو میرے دل سے سلجھ نا پائی
تمھاری حد سے نکل نا پائی
کہ تم بھی آخر گزرتے لمحوں کی
!!آندھیوں میں سنبھل گئے نا۔۔۔
وفا کے دعوں کو تم بھلا کر

!!جفا کی دھن میں بہل گئے نا۔۔

!!!!!وہی ھوا نا۔۔۔۔۔۔

!!!!!بدل گئے نا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

افشاں افشؔ

برف موسم

ہر اک موسم کا اپنا ہی الگ انداز ہوتا ہے
چھپا فطرت کا اسمیں اک انوکھا راز ہوتا ہے
بدلتی فکر ہے سب کی بدلتے موسموں کے ساتھ
ہم ان سے بات کرتے ہیں یہ سنتے ہیں ہماری بات
بہت مسحور کن لگتا ہے یخ بستہ سا یہ موسم
جلا کر آگ اس کے سامنے سب بیٹھ جاتے ہیں
بہت سی مونگ پھلیاں اور چلغوزے بھی کھاتے ہیں
کچھ چھلکے پھینک کر اسمیں شراروں کو بڑھاتے ہیں
کبھی جب بجھتے شعلوں سے دھواں سا پھیل جاتا ہے
نمی اور اس کی خوشبو سے فضا میں کیف چھاتا ہے
دریچوں سے نظر آتے ہیں ہر سو دھند کے بادل
کہر آلود شب کا گریہ ہلچل سی مچاتا ہے
چمکتا برف سا موسم مسیحا بنتا جاتا ہے

ڈاکٹر شہناز مزمل

بنجر رت کے گیت

لہر اٹھتی ہے طوفان بنتی نہیں

آگ جلتی ہے، دامن پکڑتی تو ہے

پر جلاتی نہیں

اس لیے آج کل دل کو بھاتی نہیں

ہجر کی تپ بھی سرما کی بس دھوپ سی

درد سہلاتی ہے

دل جکڑتی نہیں

وصل کا راگ دیپک تو ہوتا نہیں

نرم سی اک اگن، ایک میٹھی جلن

کچھ بھی ویسا نہیں

جیسے ہونے پہ سینے میں اگنی جلے

جیسے ہونے سے سانسیں بھی رک رک چلیں

سانس کی ڈور میں کوئی اٹکن نہیں

تم نہیں ہو تو کیا

اور ہو بھی تو کیا

بارشِ ہجر ہو، وصل کی دلکشیں لہر ہو

دل مچلتا نہیں

میری دہلیز تک نظم آ جاتی ہے

پر مرے گھر میں پر ویش ہوتی نہیں

کوئی خواہش مرے گوشہءِ چشم کو اب بھگوتی نہیں

اب میں روتی نہیں

فاخرہ نورین

تجھے آخری بار جب میں نے دیکھا

تو حیرت زدہ شام کی زرد کرنیں
کسی گمشدہ روشنی والے لمحے کو
پلٹا کے لانے کی دُھن میں
اندھیری گپھا کو
بڑھی جا رہی تھیں
المناک پیڑوں کے سائے
سمٹ بھی چکے تھے
سبھی سلسلے، رسم و عدہ و رخصت
... نمٹ بھی چکے تھے
تجھے آخری بار جب میں نے دیکھا
تو لہرا کے اُٹھتے تھے گمنام جھونکے
بہت اُلجھی شاخوں پہ رکھا ہوا
بوجھ جھڑنے لگا تھا
کسی شوق رفتہ، کسی رنج تازہ کا
اُس شام کے سانولے، سرد چہرے پہ

کوئی نشاں تک نہیں تھا

وہ لمحہ تھا جب

اُس گراں بار، دیرینہ خواہش کا دل میں

... گُماں تک نہیں تھا

پھسلتی نگاہوں میں بے تابیوں کا

دھواں تک نہیں تھا

تجھے آخری بار جب میں نے دیکھا

تو معمول کی ایک ساعت تھی

پر یہ ابھی تک کہیں ان زمانوں

... کی آغوش میں جھولتی ہے

گلناز کوثر

تمہاری یادوں کے سہارے

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کے سویرے

تمہاری یادوں کے دن

تمہاری یادوں کی شامیں

تمہاری یادوں کے اندھیرے

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کے پت جھڑ

تمہاری یادوں کی رم جھم

تمہاری یادوں کی بہاریں

تمہاری یادوں کے دھندلکے

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کی مسافت

تمہاری یادوں کے رستے

تمہاری یادوں کے منظر

تمہاری یادوں کے نظارے

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کا کاجل

تمہاری یادوں کی لالی

تمہاری یادوں کا آنچل

تمہاری یادوں کا پیراہن

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کا روٹھنا

تمہاری یادوں کا منانا

تمہاری یادوں کی ادائیں

تمہاری یادوں کا مچلنا

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کی شمع

تمہاری یادوں کی محفل

تمہاری یادوں کے نغمے

تمہاری یادوں کے پروانے

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کا بچپن

تمہاری یادوں کی جوانی

تمہاری یادوں کا فسانہ

تمہاری یادوں کا جیون

ہم نے اک زندگی جی ہے

تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کے سہارے

شاعر میاں وقارالاسلام

"یوں نہیں ہو سکتا

میٹھی ٹھنڈی نرم فضامیں

ٹہلتے ہوئے پرندے

دھکتی یاد کی پٹری پہ چڑھ دوڑے ہیں

اور ارد گرد کی جلتی بجھتی روشنیاں

چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر دائیں بائیں بے چینی سے اونگھتی گاس کی سمت اچھال رہی ہیں

کسقدر سناٹا ھے

!!! دور سے آتی ٹرین کی سیٹی منتشر کر رہی ھے تمام سوچ کے استعارے

خود کشی کی موت اب عام ہو چکی ھے

,لوگ زندہ لاشوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں

تم مجھے ہی دیکھ لو میں پچھلے کئی سالوں سے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں

مگر ہر آتی جاتی سانس مجھے کاٹ کھانے والی نظروں سے دیکھتی گزر رہی ھے

میں مسکرا کر ہر آنے والے دن کا استقبال کر رہی ہوں

لمحہ لمحہ مر رہی ہوں

سانسوں میں زہر بھر رہی ہوں

زندگی کا منہ چڑانے کو

تجھے جی کر دکھانے کو

یوں نہیں ہو سکتا
مگر میں کر رہی ہوں

یاسمین سحر

بدلتے موسم کے فاصلے سے

سرما کی اک شام

مجھ کو خواہش چائے کی

سڑک کنارے

اک رستوراں میں لے آئی

چھوٹا سا وہ چائے خانہ

جس میں بیٹھے سارے گاہک

باتوں میں مصروف

اک کرسی پر تنہا عورت

ٹھنڈی کافی سامنے رکھے

جیسے خلا میں گھر رہی تھی

میں نے سوچا

اپنی کرسی سے میں اُٹھ کر

بیٹھوں اس کے پاس

پوچھوں

کافی پینے آئی ہو

یا لمبی رات کی تنہائی

اندھیارے کمرے کی ٹھنڈک

اس گوشے کی گرمی سے

اپنے آپ کو بہلانے

یادوں میں کھو جانے کی خواہش

اس سردی میں

گھر سے باہر

کس حیلے سے آئی ہو

اس کی جانب بڑھی میں

مگر ٹھہر گئی

سامنے ایک آئینہ تھا

جس نے مجھ کو روکا تھا

شاعرہ: محترمہ فاطمہ حسنؔ

لڑکیوں کیلئے ایک نظم

زرد پھولوں کی بہاریں

منظروں میں گھل گئیں

کٹ چکی سرسوں

خزائیں ہنس رہی تھیں کھیت پر

پھر اچانک حیرتوں میں ذہن میرا گم ہوا

ایک تنہا پھول ٹہنی پر لہکتا دیکھ کر

ایک تتلی بن گئی میرے تعجب کا جواب

طوفِ گل میں منہمک جس وقت وہ آئی نظر

میں نے سوچا کاٹنے والی کوئی عورت ہی تھی

کب ہے میرے شہر کے مردوں کو جذبوں کی خبر

منصور آفاق

مخاطب ہے انسان

تو لاکھ دوڑ لے مگر مدار میں ہی رہتا ہے
ترے خیال کا فلک غبار میں ہی رہتا ہے
کسی گنہ گزشتہ کا ملال ہے ضمیر پر
ابھی تلک جو ذہنی خلفشار میں ہی رہتا ہے
تمام رات بے سبب ادھر ادھر میں کاٹ دی
یہ فکر کا سفر بھی انتشار میں ہی رہتا ہے
محیط جس طرح ہے دائرے پہ تیرا یہ سفر
صفر سے چل کہ نقطہ بھی شمار میں ہی رہتا ہے
ترے سکون سے سبھی سکون ہیں جڑے ہوے
مگر یہ تو کہ راہِ خلفشار میں ہی رہتا ہے
پیالہ و صراحی و سبو یہاں ہیں رائگاں
سکون دل تو خود پہ اعتبار میں ہی رہتا ہے
خدا نے تجھ کو سونپ رکھی ہیں خرد کی لذتیں
مگر تو بس وجود کے خمار میں ہی رہتا ہے
یہ گلستان کاش اب خزاں میں بھی کھلا رہے
یہ خوشبوؤں کا ربط کیوں بہار میں ہی رہتا ہے

حیات محوِ رقص ہے سرور میں ہے یہ جہاں

مفارقت کا سوگ سوگوار میں ہی رہتا ہے

اٹھو اسیر نقش پائے غیر، شش جہت چلو

سفر کا وقت و سمت تو سوار میں ہی رہتا ہے

جہاں میں جنگ اور پیار کے اصول ایک سے

یہ گرنا اور سنبھلنا شہسوار میں ہی رہتا ہے

وہ جسم ہے مرا اسیر جو قفس کا، باخدا

مرا یہ دل تو یار کے دیار میں ہی رہتا ہے

غبار پر فریفتہ تجھے بھلا یہ کیا خبر

کہ اصل حسن روح کے نکھار میں ہی رہتا ہے

سفر کرے گی عزہ ہی زمیں سے ان خلاؤں تک

مگر غبارِ راہ رہگزار میں ہی رہتا ہے

عزّہ یاسمین

"امجد اسلام امجد کی نظم "آخری چند دن دسمبر کے

آخری چند دن دسمبر کے

ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں

خواہشوں کے نگار خانے میں

کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں

رفتگاں کے بکھرتے سالوں کی

ایک محفل سی دل میں سجتی ہے

فون کی ڈائری کے صفحوں سے

کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے

جن سے مربوط بے نوا گھنٹی

اب فقط میرے دل میں بجتی ہے

کس قدر پیارے پیارے ناموں پر

رینگتی بدنما لکیریں سی

میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں

دوریاں دائرے بناتی ہیں

دھیان کی سیڑھیوں میں کیا کیا عکس

مشعلیں درد کی جلاتے ہیں

ایسے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں

حادثے کے مقام پر جیسے

خون کے سوکھے نشانوں پر

چاک کی لائنیں لگاتے ہیں

ہر دسمبر کے آخری دن میں

ہر برس کی طرح اب بھی

ڈائری ایک سوال کرتی ہے

کیا خبر اس برس کے آخر تک

میرے ان بے چراغ صفحوں سے

کتنے ہی نام کٹ گئے ہونگے

کتنے نمبر بکھر کے رستوں میں

گردِ ماضی سے اٹ گئے ہونگے

خاک کی ڈھیریوں کے دامن میں

کتنے طوفان سمٹ گئے ہونگے

ہر دسمبر میں سوچتا ہوں میں

ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے

رنگ کو روشنی میں کھونا ہے

اپنے اپنے گھروں میں رکھی ہوئی

ڈائری، دوست دیکھتے ہونگے

ان کی آنکھوں کے خاکدانوں میں

ایک صحرا سا پھیلتا ہوگا

اور کچھ بے نشاں صفحوں سے

نام میرا بھی

کٹ گیا ہوگا

(امجد اسلام امجد)

وجود

سمندر

برف....آئینہ

وجودِ صنفِ نازک کی یہ تشریحیں

یہ تشبیہیں

نگاہِ شاعرِ خوش خو میں سرمایہء الفاظ و معانی

وجودِ دلبراں

تمثیلِ آئینہ چیخ جائے سمندر کی طرح شفاف

اگر محبوب کی بانہوں میں آ جائے

وجودِ دلبراں پھر برف کی صورت پگھل جائے

علی قیصر

نیا سال

نیا سال تمہیں

اِک ایسے سفر پہ لے کر چلے

جہاں چاہتیں

تیری شریکِ حیات بنیں

اور مسرتیں

ہم سفر ہوں

جہاں تمہارے

نقشِ پا پہ چلیں

رنگ و بو کے میلے

اور تم پر نچھاور ہوں

سبھی ماہ و ایام

جہاں لمحہ لمحہ تم پر گرائے

سُرخ پھولوں کی پتیاں

اور تم پر سایہ کریں

وقت کی بدلیاں

اور تم پر تمام ہوں

رحمتوں کی بارشیں

اور تمہارے منتظر ہوں

عید و تہوار

اور تمہارے آنچل سے اُڑے

موسمِ بہار

اور تمہاری زلفوں سے برسیں

رم جھم برساتیں

ایسا ہی اک نیا سال

تمہیں ہر سال مبارک ہو

شاعر: میاں وقارالاسلام

شہزاد قیس کی نظم

ہر سِتم ایک دَم دِسمبر میں

جَم سے جاتے ہیں غم دِسمبر میں

سال بھر اِس لیے میں رویا ہُوں

...دِل بھرے کم سے کم دِسمبر میں

یادیں چھٹی منانے آئیں تھیں

گھر سے نکلے نہ ہم دِسمبر میں

ہر شجر پر خَزاں نے گاڑ دِیا

ایک اُجڑا عَلَم دِسمبر میں

برف کی کرچیاں ہیں پلکوں پر

آہ! یہ چشمِ نم دِسمبر میں

دیکھ کر مارا مارا چڑیا کو

شاخ تھی قدرے خم دِسمبر میں

لمبی راتوں کا فیض ہے شاید

ضم ہُوئے غم میں غم دِسمبر میں

جوہرِ اَشک سے بغیر اَلفاظ

ڈائری کی رَقم دِسمبر میں

برف نے رَفتہ رَفتہ ڈھانپ دِیئے

تین سو دَس قدم دِسمبر میں

ریڑھ کی ہڈی تک اُتر آئے

سرد مہری، اَلم دِسمبر میں

لیلیٰ سے بڑھ کے موت اَچھی لگی

قیس رَب کی قسم دِسمبر میں

"کفن چور"

کچھ نہیں، گھر میں مرے کچھ بھی نہیں
کوئی کپڑا کہ حرارت کو بدن میں رکھتا
لُقمہءِ نانِ جَویں، خوُن کو دَھکا دیتا
مَن کو گرماتا سُکوں، تَن سے لپٹتا بستر
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں
رات کو جسم سے چِپکاتی ھوُئی سَرد ھوا
جسم کے بند مَساموں میں اُترتی ٹھنڈک
سنگِ مَرمَر سی ھوُئیں خوُن ترستی پوریں
ھاتھ لرزاں تھے، اُمیدوں نے مگر تھام لیے
پاؤں چلتے ھی رھے شہرِ خموشاں کی طرف
!پردہءِ خاک میں لپٹے ھوُئے بے جان وجود
باعثِ تنگِ زمیں ھوُں، مگر اِک بات بتا
جسم مٹی ھو تو کپڑوں کی ضرورت کیا ھے؟
دیکھ پیوندِ زمیں ! میرے تَنِ عُریاں پر
داغِ افلاس کا پیوند۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اجازت دے دے
مَر کے، مَرتے ھوُئے انسان کو زندہ کر دے

ایک ملبُوس کمانے کی اجازت دے دے

ورنہ بُھوک کی ھے بہت خاک، کہاں دیکھے گی

! جسم کھا جائے گی، پوشاک کہاں دیکھے گی

(شہزاد نیر)

کنگن

کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوتا

تو بڑے پیار سے چاوءں سے بڑے مان کہ ساتھ

اپنی نازک سی کلاءی میں چڑھاتی مجھ کو

بڑی بے تابی سے فرقت کہ خزاں لمحوں میں

تو کسی سوچ میں ڈوبی جو گماتی مجھکو

میں تیرے ہاتھ کی خوشبو سے مہک سا جاتا

جب کبھی موڈ میں آ کر مجھے چوما کرتی

میں تیرے ہونٹوں کی حدت سے دہک سا جاتا

رات کو جب بھی تو نیندوں کے سفر پر جاتی

مرمری ہاتھ کا تکیہ سا بنایا کرتی

میں تیرے کان سے لگ کر کءی باتیں کرتا

تیرے زولفوں کو تیرے گال کو چوما کرتا

جب بھی تو بند قبا کھولنے لگتی جاناں

آپنی آنکھوں کو تیرے حسن سے خیراں کرتا

مجھ کو بے تاب سہ رکھتا تیری چاہت کا نشہ

میں ترے جسم کہ آنگھن میں کھنکتا رہتا

میں تیری روح کہ گلشن میں مہکتا رہتا

جناب وصی

صبحِ مست

صبحِ مست

تیری انگڑائیوں سے

طلوع ہوتی ہے

دن نکلتا ہے

تیرے ہونٹوں کے

مسکرانے سے

ہے موسموں میں

یہ گرمی، سردی

تیرے مزاج سے

بہار آتی ہے

تیرے آنچل کے

لہرانے سے

یہ سرمئی شام

ڈھل رہی ہے

تیرے شرمانے سے

یہ رتِ شبی

تیری زلف کے

بکھرانے سے

شاعر: میاں وقارالاسلام

وہ آپ نظم

ہے پھولوں سی
نازک بھی وہ
ہے کانٹوں سی
چبھن اس میں
ہے عشق اور
جنوں اس میں
ہے چاہت اور
لگن اس میں
ہے نظر بھی
دیکھتی اسے
ہے دل بھی
مگن اس میں
وہ خود غزل
وہ آپ نظم
ہے شاعری کا
وزن اس میں

وہ خود بہار

وہ آپ چمن

تمام رتوں کا

حسن اس میں

وہ خود عید

وہ آپ تہوار

نئے سالوں کا

جشن اس میں

شاعر: میاں وقارالاسلام

دسمبر لوٹ جاتا ہے

اُسے کہنا کہ حیرانی مجھے حیرت سے تکتی ہے
مرے جیون پہ خود بھی زندگی روتی ہے ہنستی ہے
نظر جب بھی ہتھیلی کی لکیروں سے الجھتی ہے
ان آنکھوں سے جھڑی ساون کی
پھر کچھ ایسی لگتی ہے
مرا دل رک سا جاتا ہے
مہینہ ہجر کا جب بھی
مرے آنگن میں آتا ہے
اداسی کے ہر اک منظر کو وہ موجود پاتا ہے
نگاہوں کو جھکا کر بس دسمبر لوٹ جاتا ہے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

تجھے آخری بار جب میں نے دیکھا

تو حیرت زدہ شام کی زرد کرنیں
کسی گمشدہ روشنی والے لمحے کو
پلٹا کے لانے کی دُھن میں
اندھیری گُپھا کو
بڑھی جا رہی تھیں
المناک پیڑوں کے سائے
سمٹ بھی چکے تھے
سبھی سلسلے، رسم وعدہ و رخصت
نمٹ بھی چکے تھے ...
تجھے آخری بار جب میں نے دیکھا
تو لہرا کے اُٹھتے تھے گمنام جھونکے
بہت اُلجھی شاخوں پہ رکھا ہوا
بوجھ جھڑنے لگا تھا
کسی شوقِ رفتہ، کسی رنجِ تازہ کا
اُس شام کے سانولے، سرد چہرے پہ
کوئی نشاں تک نہیں تھا

وہ لمحہ تھا جب

اُس گراں بار، دیرینہ خواہش کا دل میں

... گُماں تک نہیں تھا

پھسلتی نگاہوں میں بے تابیوں کا

دھواں تک نہیں تھا

تجھے آخری بار جب میں نے دیکھا

تو معمول کی ایک ساعت تھی

پر یہ ابھی تک کہیں ان زمانوں

... کی آغوش میں جھولتی ہے

گلناز کوثر

!فقط ایک پھول

پرندے لوٹتے دیکھے، تو یہ دھوکا ہوا مجھ کو
کہ شاید جستجو میری،
یا کوئی آرزو میری،
ترے در سے پلٹ آئی
مجھے تنہا بیاباں سے گزرتے لگ رہا ہے ڈر
جدائی کے شجر کی اب حفاظت بس سے باہر ہے
یہ پانی آنکھ سے گرتا،
اگر سیلاب ہو جائے
یہ پیلی دھوپ، مہکی رُت،
سراب و خواب ہو جائے
تو پھر اس تشنہ روش میں،
پھوٹتی کلیوں کے سب نغمے
سنانے کو ترستی خواہشیں، ناکام ٹھہریں گی
مثالِ رفتگاں، جاتے ہوئے مہکے ہوئے لمحے
خزاں کے زرد پتوں کے لئے ہی قرض لے آؤ

مسلسل جو اُداسی پر اداسی،

یوں برستی ہے

کہیں مرجھا نہ دے، سرسبز اس شاخِ محبت کو

تعلق کی بھی میری جان، اک میعاد ہوتی ہے

پھر اس کے بعد،

ہر بندھن سے جان آزاد ہوتی ہے

خزاں کی جیت سے پہلی

ذرا یہ دھیان کر لینا

کہ سینے میں، مرا دل ہے۔۔۔

!!! فقط اِک پھول

فرزانہ نیناں

جواں قوموں کی آزادی

پیامِ مذہب و ملت سے برتر ہے

جنونِ سرحد و زنجیر سے افضل

کوئی بے خوف لمحہ

جو اطاعت سے نہیں ملتا

مری نسلِ خزاں دیدہ کی آزادی

کسی پیدائشی اندھے کا اک خوابِ مسلسل ہے

کوئی ناآشنا ساعت۔۔۔

کوئی رسمِ جفا ہے

جو قبولِ عام ٹھہری ہے

مری نسلِ خزاں دیدہ کی آزادی

گرفتہ سوچ کی صورت

کہیں ٹھہرا ہوا پانی۔۔۔

کہیں تاریک سا شیشہ۔۔۔

کہیں بجھتی ہوئی آنکھوں کا بے آواز گریہ ہے

مری نسلِ خزاں دیدہ کی آزادی

بزرگوں سے وراثت میں ملے

خوابوں کا وہ نادر خزینہ ہے

جسے مدت سے ہم صرفِ نظر کر کے

سکوتِ مفلسی میں

بے حس و مایوس پھرتے ہیں

سعید خان

دسمبر آگیا ہے۔۔۔

اب تمہیں بھی آنا ہوگا
برف کی مانند
کِرنوں سا چمکتا، جگمگاتا
اک روپہلا جوڑہ لے کر
کانوں کے جھمکے۔۔۔
سنہرے، ہاتھوں کے کنگن
چھنکتی، پاؤں کی پائل۔۔۔
جسے میں زیبِ تن کرکے
پھروں گی مورنی کی طرح
فَر کے کوٹ سے تن کو چھپائے،
تمہارے بازؤں میں جھولتی۔۔۔
اور برف کے گولے بنا کر
پھینکتی شوخی شرارت سے
تمہاری سمت، ہر جانب
دسمبر آگیا ہے
تم بھی آجاؤ۔۔۔
تو ہم ہر روز آتشدان کے آگے
مگوں میں سوندھی سوندھی
بھاپ اُڑتی کافی کے
کچھ گھونٹ لے کر

دیر تک، اک دوسرے کو
اپنی اپنی شاعری
گا کر سنائیں گے۔۔۔
دسمبر آگیا ہے۔۔۔
! اب تمہیں بھی آنا ہوگا

صبیحہ خان صبیحہ

دسمبر لیٹ آیا ہے

دسمبر نے ہماری پسلیوں
کو توڑ ڈالا ہے
سبز پتوں کو ہواوں نے
زمیں پر رول ڈالا ہے
دسمبر لیٹ آیا ہے
مگر کیا خوب آیا ہے
مرے سرسبز آنگن میں
بس اب نرگس کی خوشبو ہے
جریبن کی کمر بھی توڑ
ڈالی ہے یخ بستہ ہواوں نے
خوبانی، سیب اور بادام
انگوروں کے جنگل بھی
لباسِ تن سے شرمندہ
گلابوں کے سبز پتوں کو
دیکھ کر حیران ہیں

اکرم خاور

وہ پاگل

دسمبر جب بھی آتا ہے
وہ پاگل پھر سے اپنی
بے بسی کو یاد کرتا ہے
پرانے خط کو پڑھتا ہے
کہ جس میں اُس نے بولا تھا
میں لوٹوں گی دسمبر میں
نئے پردے لگاتا ہے
وہ سارا گھر سجاتا ہے
دسمبر کے دنوں کو وہ
ہمیشہ یاد کرتا ہے
گزرتی ہے جو سردی تو
اُداسی گنگناتی ہے
وہ اپنی بے بسی میں بھی
اُسی کو یاد کرتا ہے
اُسے معلوم ہے وہ سب
جو اُس کے ساتھ ہوتا تھا
بہت بے چین کرتی ہیں
ذہن بے تاب کرتی ہیں
وہ یادیں پھر سے
اُس کے عشق کو سیراب کرتی ہیں
سبھی دن بیت جاتے ہیں
دسمبر ختم ہوتا ہے
مگر وہ خوش گماں لڑکا
دسمبر کے مہینے کو

دوبارہ یاد کَرتا ہے
اور اُس کے سحر میں اک بار
پھر سے ڈوب جاتا ہے
کہ اس نے تو بتایا تھا
میں لوٹوں گی دسمبر میں

اکرم خاور

دسمبر

وہ دس بارہ مہینوں میں
بڑا ممتاز لگتا ہے
دسمبر کس لئے آخر
ہمیں مہناز لگتا ہے
بہت بے چین سی صبحیں
شرارت سے بھری شامیں
محبت کھوئی کھوئی سی
وہ راتیں سوئی سوئی سی
کبھی گزرے خیالوں کا
کبھی مُشکل حوالوں کا
بچھڑ جانے کی بے تابی
دُعا کی آس لگتا ہے
دسمبر کس لئے آخر
ہمیشہ خاص لگتا ہے

اکرم خاور

سُنو ! !
دسمبر___لوٹ آیا ہے
اور
تمہاری خوشبو
میرے ہر اک مسامِ جاں سے
پھوٹتی معلوم ہوتی ہے
میرے چاروں اور
تمہاری خوشبوؤں نے
کہرام مچا رکھے ہیں
میرے ویران کمرے کا . . .
ہجر زدہ سنسان اندھیرا . . .
اور سوکھی مُردہ یادیں . . . .
روشن، اور معطر لگنے لگے ہے . .
اور بستر کی سلوٹیں
تمہارے وجود کی
معطور تھکانیں
سمیٹے ہوئے ہیں
تجھ سے بچھڑے
بہت برس بیت گئے
لیکن ! !
ہر دسمبر میں
ادھُورے وصل کی ساعتیں
بہت اداس کرتی ہیں
تمہارے ساتھ بیتے لمحوں کی
اک اک ادا . . . . .

گھنٹوں بے چین رکھتی ہے
میں ہر دسمبر میں اب تک
بس ایک دسمبر جیتا ہوں
تجھ سے اپنے لاحاصل عشق کی
کڑواہٹ گھونٹ گھونٹ پیتا ہوں
سنو!!
دسمبر لوٹ آیا ہے

فیصل ملک!!!

ساڈے ماس دا بالن بال کے

ساڈا ہسدا جوبن گال کے

سانوں اگاں وچ اچھال کے

کوئی سولی اتے ٹنگ گیا

اک ہور دسمبر لنگھ گیا

سانوں سفنیاں اندروں رول کے

سانوں یار ملن دا بول کے

ساڈا سینا اندروں پھول کے

کوئی بدل تھل دا کھنگ گیا

اک ہور دسمبر لنگھ گیا

سانوں اندرو اندری توڑ کے

سانوں ککھاں وانگ مروڑ کے

سانوں قبراں دے وچ روڑھ کے

کوئی ساہواں ساتھوں منگ گیا

اک ہور دسمبر لنگھ گیا

شاعر: صغیر تبسم

دسمبر

راہ گزر
کہرے میں لپٹی ہوئی ہے
فضا میں اداسی سی
رچ گئی ہے
دور کہیں اک ہیولا سا ہے کہ
نظر دھوکا کھا رہی ہے
سرسراتی سرد ہوا
جیسے کوئی نوحہ سنا رہی ہے
برف سا وجود لیے
وہ زندہ ہے یا
محض سانس آ جا رہی ہے

کنول بہزاد

گلابی دسمبر کی اک التجا••••••

گلابی دسمبر کی پر کیف چھاؤں

کھنکتی ٹھٹھرتی مہکتی ھواؤں

جھجھکتی جھلکتی سجل التجاؤں

کہیں لاپتہ ایک جنگل کو جاتی

! غمِ ہجر میں بھیگتی ،اپنی گہری نگاھوں

! بہت دور تک جاتی، بل کھاتی راھوں

! ! مِیں اک عمر سے یونہی تنہا کھڑی ہوں

کسی شخص کے نام کاایک آنچل جو اوڑھے ہوئے اب بھی

تنہا کھڑی ہوں میں کتنے برس سے

تصور سے مہکی ھوئی

آرزوؤں کی بیساکھیوں کے سہارے

کہ اکدن کہیں سے

وہی خوش ادا وہ سراپا محبت

دسمبر کی چمکیلی سی دھوپ جیسا

وہ سہون کی درگاہ میں

اترا ہوا چاند

...وہ پھر اپنے شانوں پہ اک شال اوڑھے

!اچانک سے آئے

..تو دھڑکن تڑپ کر ذرا تھم سی جائے

ٹھٹھرتے سے لہجے میں، تھوڑا جھجھک کر مرا نام لے وہ

کہے جانتا ہوں تمہیں ہے دسمبر میں مجھ سے یہ ملنے کی خواہش جو اتنے برس سے

بُرا ہوں "مگر اِس قدر بھی نہیں ہوں "

"کہ چھوٹی سے خواہش کی تکمیل نا ہو

بتاؤ! جو دل میں ہے بولو سبھی کچھ

کہ میں آ گیا ہوں گلابی دسمبر کی اک شام میں تم سے ملنے

"کہ جس کا کبھی ذکر تم نے کیا تھا

میں اسکی نگاھوں میں

کچھ ساعتوں کے لئے ڈوب جاؤں

وہ چشمِ کرم کہ دسمبر کوئی, سرمئی سا

ہو ڈھلتے سے سورج کا رنگ اپنی مٹی سے ملتا ھوا گندمی سا

وہ اک حسن ایسا کہ جس پر کتابیں کئی لکھ کے ساری اُسی کی محبت کے نام انتساب ہوں

!وہ کچھ ہی گھڑی گر ملے تو

گلابی دسمبر مہکنے لگے

گلابی دسمبر کی اک شام ہی بس

میرا حاصلِ زندگی ہو••••••

کہ پھر مر بھی جاؤں تو افسوس نہ ہو•••••

گلابی دسمبر کی پُر کیف چھاؤں میں بیتے ہوئے چند لمحے

انہی کے سہارے میں عمریں بِتا دوں••••••

بتاؤ سخی! بھیک اتنی ملے گی؟؟؟ کہ میں جی سکوں••••••؟؟

کنول ملک

زرد گلاب

سنو جاناں اگر سن سکو تو

یہ خاموش رستے

تمھیں یاد کرتے ہیں

مجھ سے فریاد کرتے ہیں

وہ بوڑھا شجر

جس کے سائے میں

ہم پہروں باتیں کرتے تھے

اسکے سینے میں دفن

کھنکتی میری ہنسی

اب سسکیاں بن کے ابھرتی ہیں

سنو

کچھ وقت دو گے پھر

تمھیں اک قصہ سنانا ہے

وہ جو بیتا زمانہ ہے

پڑوس کی وہ بوڑھی نانی

جو کہانی سناتیں تھیں

ہمیں ساتھ رہنے کی

دعائیں بھی دیتی تھیں

زمانہ بیتا

اب انکی آنکھوں میں

روشنی تو نہیں

صرف نمی جھلکتی ہے

دعا تو وہ اب بھی دیتی ہیں

اب ان دعاؤں میں

تم شامل نہیں ہوتے

سکول کی گھنٹی اب بھی بجتی ہے

پر اسکول کے باہر اب تم نہیں ہوتے

سنو کچھ یاد ہے تم کو

ہم نے

بچپن کیسے گزرا تھا

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے

ہم جس رستے پہ چلتے تھے

وہاں زرد گلاب کھلتے تھے

وہ پھولوں بھرا رستہ

زرد گلابوں سے بھرا رستہ

اب بھی ہمیں یاد کرتا ہے

مجھ سے فریاد کرتا ہے

سنو اک بات اور کہنی ہے

جو تم نے دئے تھے زرد گلاب سارے

وہ آج بھی میری کتابوں میں محفوظ ہیں

سنو اب لوٹ آؤ نا

مجھے بھی تم یاد آتے ہو

جب خاموش رستے

برگد کی چھاؤں

نانی کی دعائیں

وہ پھولوں بھرا رستہ

زرد گلابوں بھرا رستہ

مجھ سے فریاد کرتے ہیں

سنو اب تو لوٹ آؤ نا

وہ اسکول کی گھنٹی

وہ پھولوں بھرا رستہ

سب ملکر مجھکو چڑاتے ہیں

تمھاری یاد دلاتے ہیں

سنو جاناں محبت کی قسم تمکو

اب تو لوٹ آؤنا

اب تو لوٹ آؤنا

سیدہ زرنین مسعود

اب دسمبر کی بات نا ہو گی

کہ اس ستمگر کی بات نا ہو گی

عمر گزری سفر میں تنہا

خاموش کہ اب سفر کی بات نا ہو گی

ڈھونڈتے رہے در و دیوار میں سکوں

مسمار ہوئے دل کے نگر کی بات نا ہو گی

بنایا تھا بہت ہی ارمانوں سے

خاک اڑاتے اس گھر کی بات نا ہو گی

مرجھا گئے کتنے ہی گھروں کے پھول

چھا گیا اندھیرا اب سحر کی بات نا ہو گی

تیرے آنے سے دسمبر نم ہو جاتی ہیں آنکھیں

بکھرے ہوئے لاشوں سر بریدہ دھڑ کی بات نا ہو گی

جاؤ ڈھونڈ لو کوئی اور شریک سفر اپنا

مجھ سے اب ہمسفر کی بات نا ہو گی

روپہلی تھے دن اور سرمئی شامیں

چھوڑو شہر یار کے قصے

دل بہلے کہ کوئی اور بات کرو

اب مجھ سے اسکے شہر کی بات نا ہو گی

اب دسمبر کی بات نا ہو گی

کہ اس ستمگر کی بات نا ہو گی

سیدہ زرنین مسعود

پت جھڑ

چاند ہے تھکا تھکا سا

سورج بھی مضمحل سا ہے

شاخ سے بچھڑے پتوں سے

راستے سبھی اٹ گئے ہیں

راہی منزل سے کٹ گئے ہیں

خزاں کا موسم آ گیا ہے

زرد ابر سا چھا گیا ہے

ادھ کھلی بے خواب آنکھوں میں

ادھورے سپنے اونگھتے ہیں

کمہلائے ہوئے پھول سارے

خوشبوؤں کو ڈھونڈتے ہیں

دھیرے دھیرے گلزار سارا

صحرا میں بدل رہا ہے

پر بہار لمحوں کا موسم

وعدہ فردا پہ ٹل رہا ہے

اداسیوں کی شال اوڑھے

خنک شام کی منڈیر پر

دل اکیلا ہی جل رہا ہے

کنول بہزاد

دسمبر اک بہانہ ہے

===========

تمہیں ہم یاد کرتے ہیں

کوئی بھی سال ہو یا پھر

مہینہ سال کا کوئی

کوئی لمحہ کوئی پل بھی

تمہاری یاد سے اپنا

کبھی خالی نہیں جاتا

ہم اپنے دل کی بستی میں

تمہیں آباد کرتے ہیں

تمہیں ہم یاد کرتے ہیں

دسمبر اک بہانہ ہے

(سہیل رضا ڈوڈھی)

(سبب اداسی کا)

ربط کچھ خاص تو نہیں

لیکن

راہ چلتے ہوئے شجر مجھ سے

تیرے بارے سوال کرتے ہیں

پوچھتے ہیں سبب اداسی کا

جانتے ہیں کہ ایک مدت سے

خود پہ اوڑھی ہے خامشی میں نے کیوں صدا کا تقاضا کرتے ہیں۔ بیٹھ جاتی ہوں زرد پتوں پر

جو شجر سے جدائی کا رونا روز روتے ہیں

ہجر ان کو بھی کھا گیا شاید

وقت سے پہلے مرنے والوں کا رنگ ایسے ہی زرد ہوتا ہے

میرے چہرے کا رنگ بھی شاید زرد پتوں سے ملتا جلتا ہے

ایسا لگتا ہے وقت سے پہلے زندگی کے شجر کی شاخوں سے زرد ہو کر مجھے بھی گرنا ہے

وقت سے پہلے مجھ کو مرنا ہے

چیخ اٹھتی ہے

دل تڑپتا ہے

یادِ ماضی کی ہوک سانسوں کو

مستقل ہجر سونپتی ہے اور

سبز لمحوں کی ریل سینے سے

جب گزرتی ہے

پسلیوں کا شور

خواب کی پٹڑیوں پہ

نیندوں کو

اک مسافت تو سونپتا ہے مگر

کب خبر منزلوں کی دیتا ہے

بس مسافت ہے زرد پتوں پر

مستقل روز کی اذیت ہے

آخرش زرد مجھ کو ہونا ہے

آخرش مجھ کو وقت سے پہلے

زرد پتوں کو اوڑھ کر خود پر

سانس کا کھیل ختم کرنا ہے

دیکھتے ہیں شجر مجھے لیکن

حیرتی ہوں کہ کس لیے مجھ سے

تیرے بارے

سوال کرتے ہیں

پوچھتے ہیں

___سبب اداسی کا

سعدیہ صفدر سعدی

ایک اور نظم

سرد موسم میں پھوار

جانے کیوں رہنے لگا

پھر کسی کا انتظار

سردی کے حوالے سے نظم ہے

سردی کا موسم

اچھے لگتے ہیں

کافی پیتے ہم

ایک سہ مصرعی نظم کہہ رکھی ہے، وہ پیش خدمت ہے

دسمبر آ گیا جاناں

نہ جانے تم کہاں گم ہو

یہی غم کھا گیا جاناں

(سید ضیاء حسین)

دسمبر آ گیا ہے اک عدم سے

یہ برس اب

سال نو کا اسم پائے گا

میں سمجھی ہوں

کہ جو بھی التوا میں تھی

وہ اک تاریخ آئے گی

کسی نے کیا ہے کھویا کیا ہے پایا؟

کوئی پل ہے نیا آیا

یا پھر سب کچھ لکھا

اس موت نے

روشن دیے روز ازل سے جو بجھاتی ہے

فقط اک راکھ یادوں کی بچاتی ہے

جو چنگاری بھری ہر سال رہتی ہے

دلوں کے آئنوں پر

چشم کی اک اشکباری کے لیے

رنجش، جدائی ہر سحر

تاریخ بدلی

کیا نیا ہے

آج بھی ہیں منتظر

آنکھیں

سنو؛

اس زندگی کے امتحاں بدلیں گے کیا؟

یا غم جہاں بدلیں گے کیا؟

بس مختصر الفاظ میں

اب یہ بتائیں گے ؟

نئ تاریخ میں سب بھول پائیں گے ؟

اگر ایسا نہیں تو کیا؟

دسمبر کی کہانی ہے

یہ کیوں سب کی زبانی ہے؟

کنیز بتول کھوکھر

اک نظم

کیاملا محبت سے

دسمبر کی آخری شامیں

مجھے اکثر

اداس کر دیتی ہیں

نہ جانے کیوں

سال بھر کے سارے

اداس بے چین لمحے

دبی دبی آوازوں سے

دل میں ہلچل کرتے ہیں

بھیگی بھیگی تنہائی

اداس لمحوں کی رفاقت میں

بے ساختہ پکار اٹھتی ہے

کیاملا محبت سے

یکطرفہ چاہت سے

بے رُخی بے خبری

اضطراب مسلسل

کیا یہی مقدر ہے

سال بھر کی چاہت کا

شاعرہ: ثوبیہ خان نیازی

رفیقِ جاں

یہ جو رات دن کا ہی کھیل ہے

کبھی روشنی

کبھی دھندلکا !!

کبھی غم کی رات سیاہ ہے

کبھی چاہتوں کی پناہ ہے

مرے ہمسفر

مرے رازداں

تجھے سب خبر ہے رفیقِ جاں

کہ یہ سایہ سایہ سی زندگی

کوئی دور ہے

کوئی پاس ہے

ترے خواب چھونے کی

آس ہے

کبھی آ قریب تو بول دوں

دلِ زود رنج کو کھول دوں

مگر اے رفیق عزیزِ جاں

یونہی زندگی کو گزارنا

کبھی راستوں کی خبر نہ ہو

کہیں منزلوں کا نشاں نہ ہو

تجھے دور دور سے دیکھنا

یہی سوچنا، یہی کھوجنا

!! کہ کہیں تو تجھ سے ملے ہیں ہم

کسی دھند میں، کسی خواب میں

!! کسی آگ میں تو جلے ہیں ہم

شائستہ مفتی

"میں تینوں فیر مِلاں گی"

میں تینوں فیر ملاں گی
کتھے؟ کس طرح؟ پتا نئیں

شاید!!
تیرے تخیل دی چِھنڑک بن کے
تیرے کینوس تے اتراں گی
یا ھورے!! تیرے کینوس دے اُتے
اک رھسمئی لکیر بن کے
خاموش تینوں تکدی رواں گی

یا ھورے!! سُورج دی لو بن کے
تیرے رنگاں وچ گھُلاں گی
یا رنگاں دیاں باھنواں وچ بیٹھ کے
تیرے کینوس نُوں ولاں گی

پتا نئیں کس طرح، کتھے

پر تینوں ضرور مِلاں گی

یا ھورے ! ! اِک چشمہ بنڑیں ھوواں گی
تے جیویں جھرنیاں دا پانی اڈ دااے
میں پانی دیاں بُونداں
تیرے پِنڈے تے مَلاں گی
تے اک ٹھنڈک جئی بن کے
تیری چھاتی دے نال لگاں گی

میں ھور کج نئیں جاندی
پر اینا جاندی آں ,کہ وقت جو وی کرے گا
اے جنم میرے نال ٹُ ُرے گا
اے جسم مُکدا اے
تے سب کج مُک جاندا اے

پر چیتیاں دے دھاگے
کائناتی کنڑاں دے ھوندے
میں انہاں کنڑاں نُوں چنڑاں گی

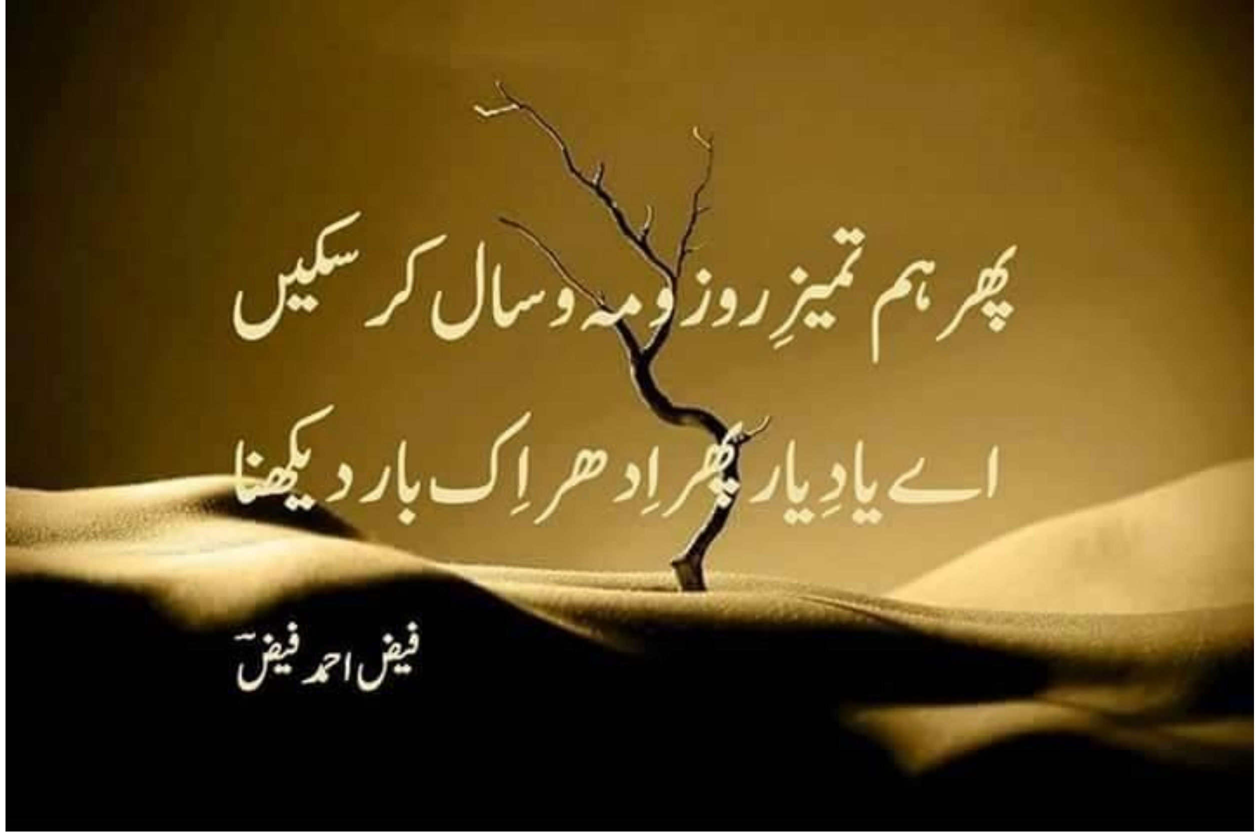
تاگیاں نُوں ولاں گی۔

تے تینوں میں فیر ملاں گی۔۔

"اَمرتا پریتم"

عشق اب ماہ مکمل سا ہوا چاہتا ہے
آنکھ وہ چھلکی ہے جلتھل سا ہوا چاہتا ہے
پہلے وہ چاند تھا پھر چاندنی پھر ابرِ رواں
اب مری آنکھ کا کاجل سا ہوا چاہتا ہے
ہر نیا سال مری عمر گھٹا دیتا ہے
اور اب سال مکمل سا ہوا چاہتا ہے

فرح گوندل


پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر اِدھر اِک بار دیکھنا
فیض احمد فیضؔ

غزل

تمثیلہ لطیف

ذہن میرا ابال دیتا ہے
بات کرتی ہوں ٹال دیتا ہے

میں نے دیکھا ہے وہ زمانے کو
اِک متاعِ خیال دیتا ہے

زندہ رکھتا ہے ہجر لوگوں کو
سب کو میری مثال دیتا ہے

سو رہا ہے غم کے وہ بستر پر
ملنے والوں کو ٹال دیتا ہے

وہ دسمبر کی سرد راتوں میں
مجھ کو تحفے میں شال دیتا ہے

اُس کی سوچیں اُڑان رکھتی ہیں
وہ تخیل کمال دیتا ہے

چھوڑ جاتا ہے مجھ کو عسرت میں
دل کو میرے ملال دیتا ہے

اُس کی عادت ہے یہ بھی تمثیلہ
مجھ کو مشکل میں ڈال دیتا ہے

دسمبر آگیا پھر سے

خزاں کی کیا ادائیں ہیں
کہ یخ بستہ ہوائیں ہیں
پتھر کے پہاڑوں پر
برفیلی سی قبائیں ہیں
دھوپ بھی مزے کی ہے
ٹھنڈے ٹھنڈے موسم میں
نرم گرم سے بستر میں
طویل شب میں سوتا ہوں
کسی کے لمس کی حدّت
کا پھر احساس ہوتا ہے
تمہیں کیسے بتاؤں میں
موسم کی رنگینی میں
خوشبو بھینی بھینی
میں

میری اداس شاموں کو
بہاروں کی ادا دے جا
پت جھڑ کے موسم میں
عجب سی اک اُداسی ہے
ایسے اجڑے موسم میں
تصور اُس کے ملنے کا
خیالوں پہ چھا گیا پھر سے
دسمبر آگیا پھر سے
دسمبر آگیا پھر سے

شمشاد سرائی



یہ دسمبر تھا

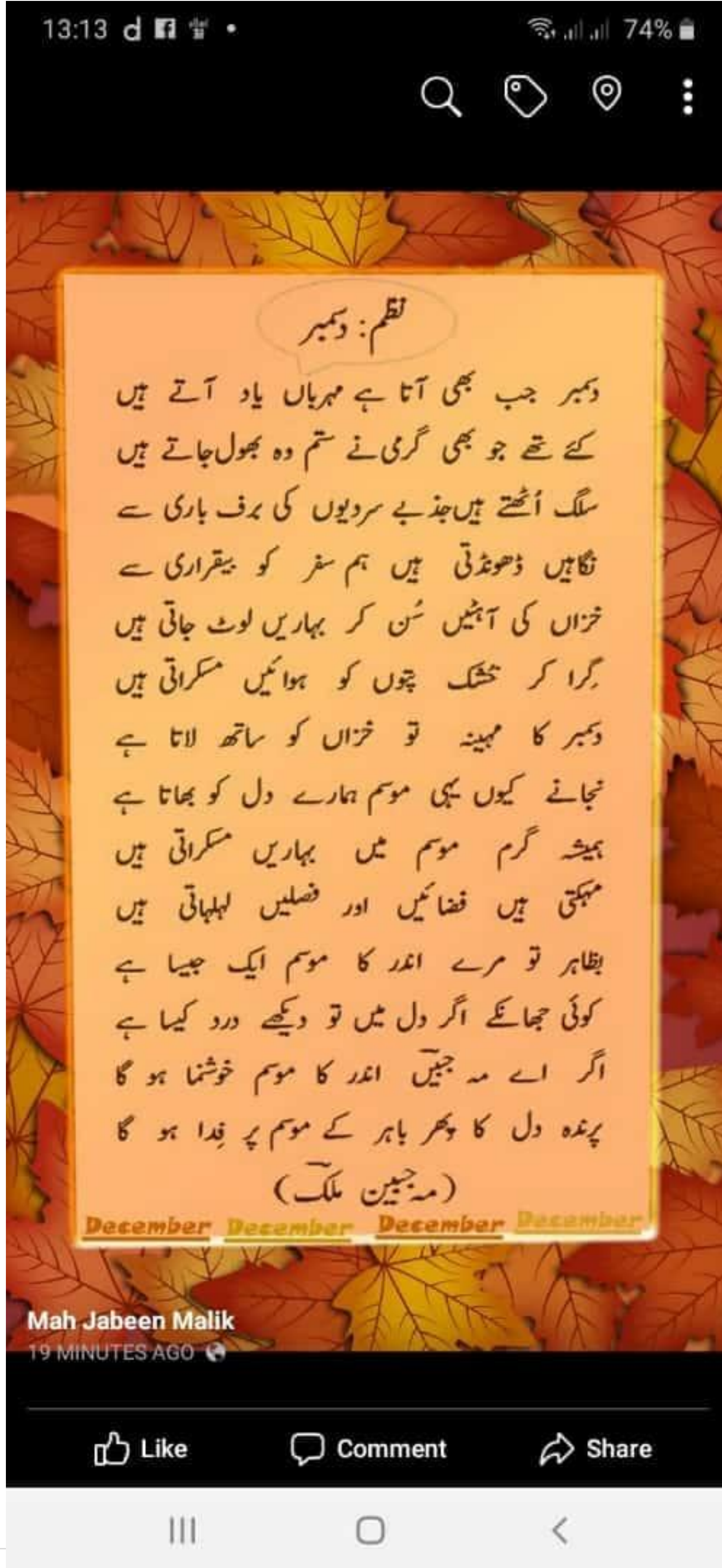
یہ دسمبر تھا کہ بھیگی ہوئی آنکھیں میری
رابطہ ٹوٹا کہ ٹوٹی ہوئی سانسیں میری
تو جو بدلا تو سب ہی رنگ ہیں بدلے بدلے
تو نہیں ہے تو ہیں مہکتی ہوئی یادیں تیری
شام ہوتے ہی جلا لیتے ہیں یادوں کے چراغ
تجھ کو سوچوں تو مہک اُٹھتی ہیں سانسیں میری
زید یہ دسمبر تھا کہ بھیگی ہوئی آنکھیں میری

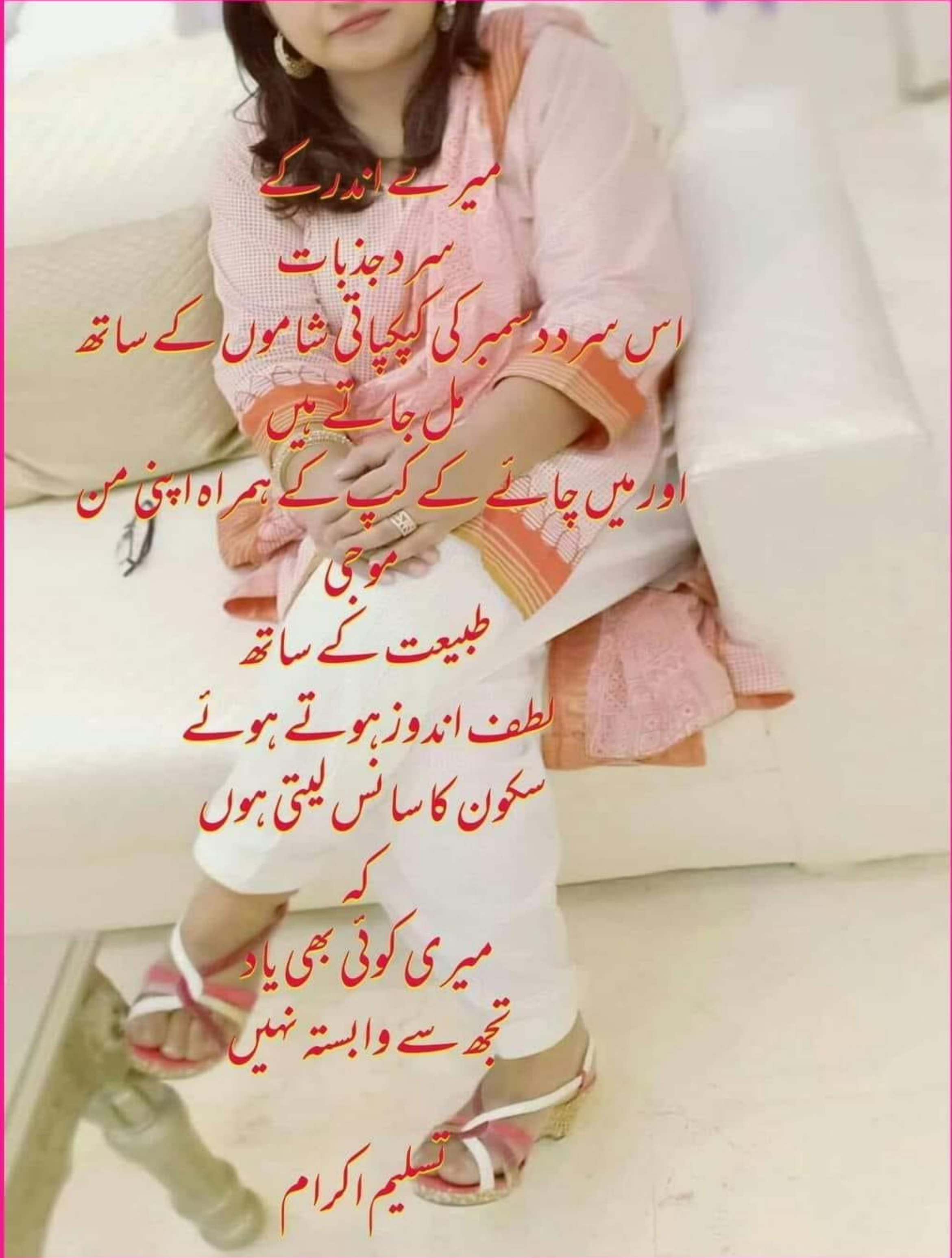
غزل

دسمبر یاد آتا ہے!!!

ہوا کا سرد جھونکا جب
مجھے چھو کر گزرتا ہے
مری سوچوں کے درپن میں
دسمبر کی چٹکتی دھوپ
اک چہرہ بناتی ہے!
ٹھٹھرتے سرد موسم میں
صبا جب گنگناتی ہے، ہوا سیٹی بجاتی ہے
رگوں میں سرسراتی ہے
تو یوں لگتا ہے کالج کی کسی کینٹین میں بیٹھی
وہ پھر سے مُسکراتی ہو۔۔۔!
میری کافی کی پیالی سے
دھوئیں کے گرم بادل نے کوئی تصویر بنائی ہو!
کوئی خوشبو کی صورت بات، نہاں تھی جو میرے دل میں
میری آنکھوں میں پڑھ کر وہ زرا سا مُسکرائی ہو!
بس اک وہ خواب سا لمحہ، ہے رخصتِ زندگانی جو
دسمبر کی خنک راتوں میں اکثر یاد آتا ہے!!
نہیں بھولا جسے اب تک
وہ منظر یاد آتا ہے!!
دسمبر یاد آتا ہے

Designed By Usman Aslam


13:13
74%
نظم: دسمبر
دسمبر جب بھی آتا ہے مہرباں یاد آتے ہیں
کئے تھے جو بھی گرمی نے ستم وہ بھول جاتے ہیں
سلگ اُٹھتے ہیں جذبے سردیوں کی برف باری سے
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں ہم سفر کو بیقراری سے
خزاں کی آہٹیں سُن کر بہاریں لوٹ جاتی ہیں
گِرا کر خشک پتوں کو ہوائیں مسکراتی ہیں
دسمبر کا مہینہ تو خزاں کو ساتھ لاتا ہے
نجانے کیوں یہی موسم ہمارے دل کو بھاتا ہے
ہمیشہ گرم موسم میں بہاریں مسکراتی ہیں
مہکتی ہیں فضائیں اور فصلیں لہلہاتی ہیں
بظاہر تو مرے اندر کا موسم ایک جیسا ہے
کوئی جھانکے اگر دل میں تو دیکھے درد کیسا ہے
اگر اے مہ جبیں اندر کا موسم خوشنما ہو گا
پرندہ دل کا پھر باہر کے موسم پر فِدا ہو گا
(مہ جبین ملک)
December December December December
Mah Jabeen Malik
19 MINUTES AGO
Like
Comment
Share


میرے اندر کے
سرد جذبات
اس سرد دسمبر کی کپکپاتی شاموں کے ساتھ
مل جاتے ہیں
اور میں چائے کے کپ کے ہمراہ اپنی من
موجی
طبیعت کے ساتھ
لطف اندوز ہوتے ہوئے
سکون کا سانس لیتی ہوں
کہ
میری کوئی بھی یاد
تجھ سے وابستہ نہیں
تسلیم اکرام

غزل

عائشہ مسعود

عکس کوئی برسوں تک رُو برُو نہیں رہتا
آدمی کی فطرت ہے ہُو بہ ہُو نہیں رہتا

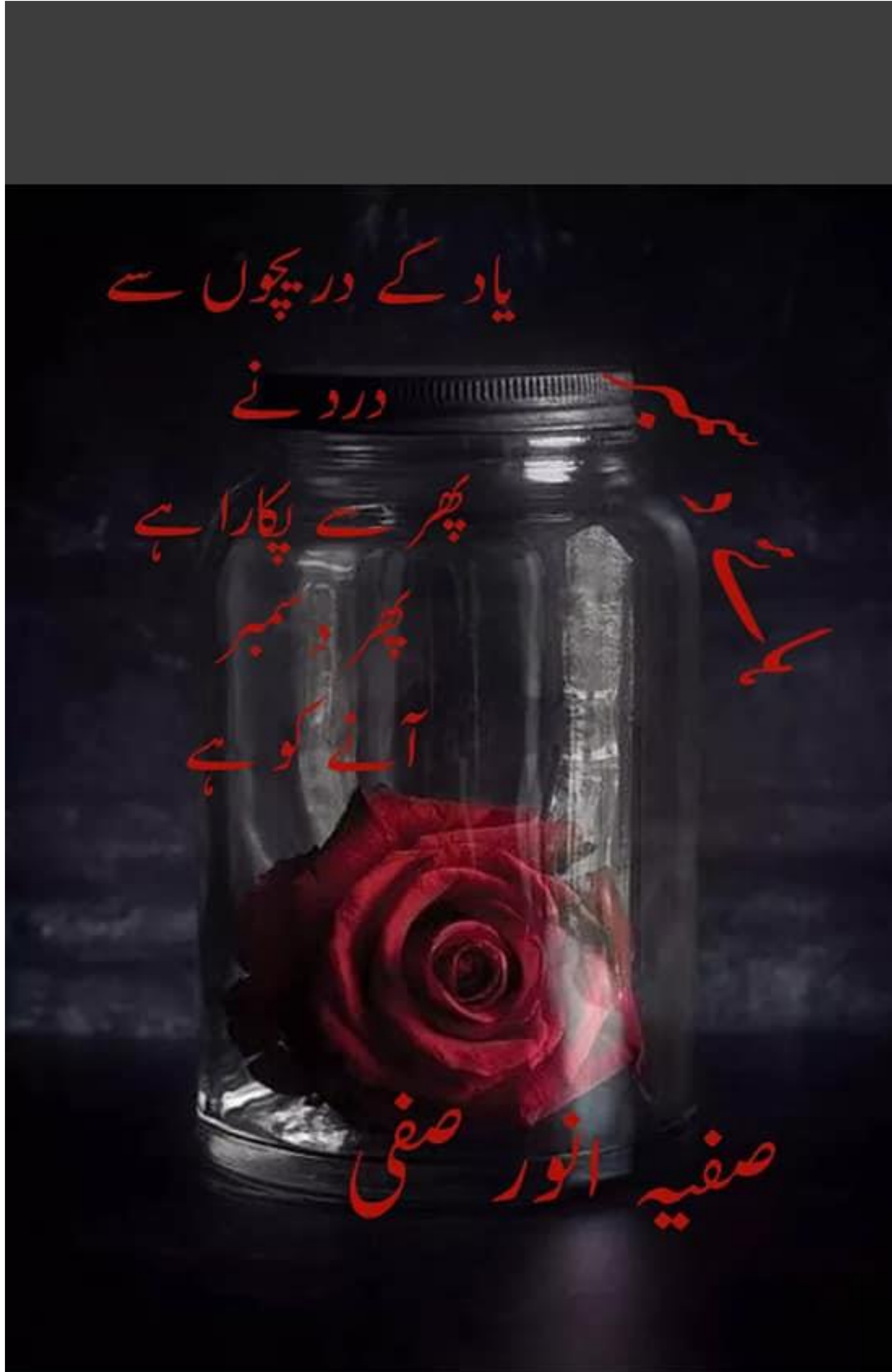
شہرِ دل کی حرمت کا جو خیال رکھتا ہے
خوشبوؤں کے جیسے وہ کُو بہ کُو نہیں رہتا

قافلہ ان اشکوں کا جب رواں ہو آنکھوں سے
غم کا کوئی منظر پھر دُو بدُو نہیں رہتا

اک چراغ تک دل میں مدتوں نہ جلتا ہو
کوئی شخص بھی اس میں پھر کبھو نہیں رہتا

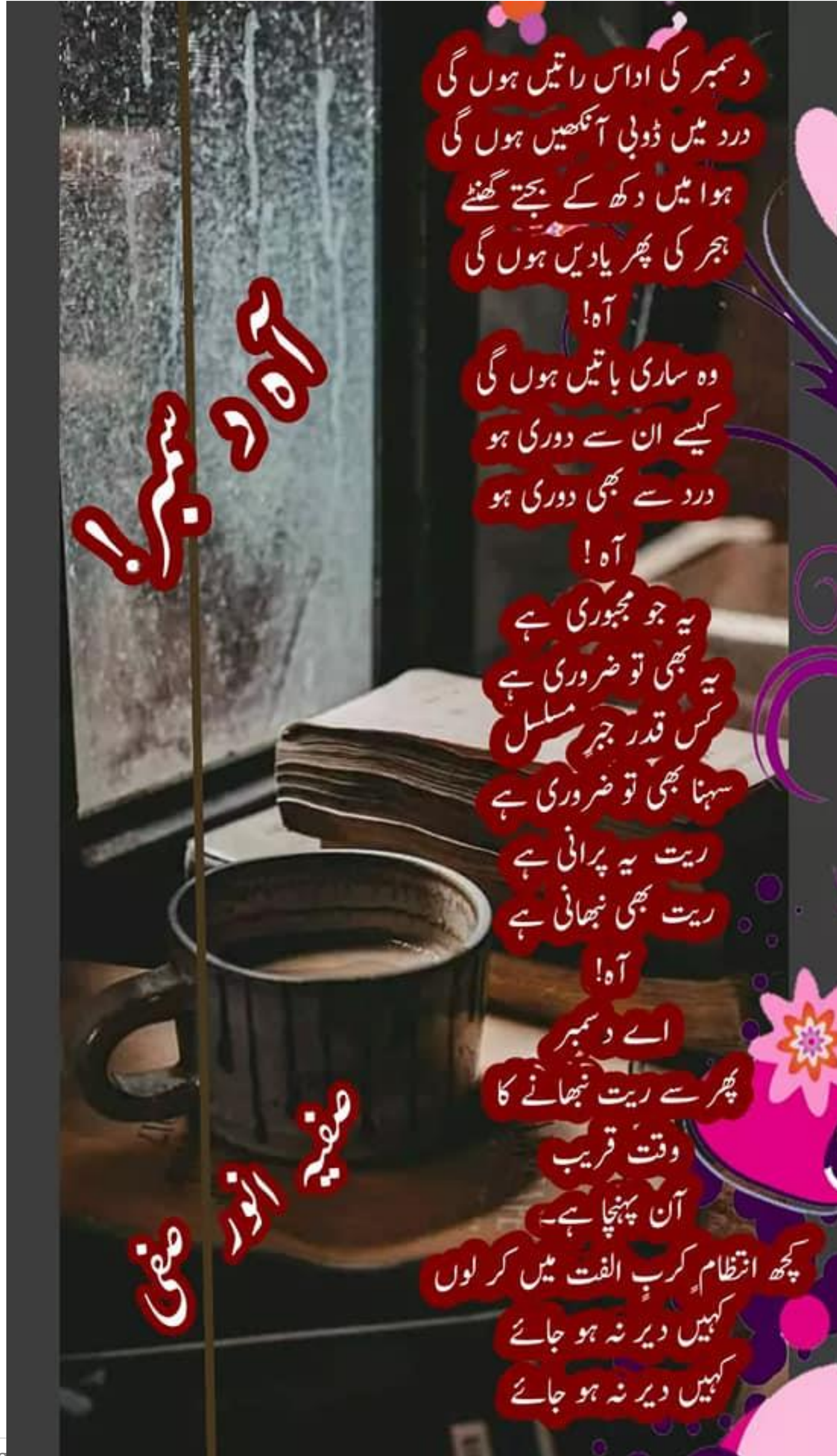
مہربان لمحوں کو پیرہن سمجھ کے تُو !
رنگ جب بدلتا ہے تُو بھی تُو نہیں رہتا

جس سے بات کر کے بھی بات پھر ادھوری ہو
پھر وہ شخص موضوعِ گفتگو نہیں رہتا


یاد کے دریچوں سے
درد نے
پھر سے پکارا ہے
پھر دسمبر
آنے کو ہے
صفیہ انور صفی

پگلی ہوا

ہوا میں سازش کی مہک
جو میں محسوس کرتی ہوں۔
ہوا کو کیسے سمجھاؤں
کہ دل کے تنہاں خانوں میں
دسمبر کی اداس راتوں میں
چھپا کر اپنے سارے درد
میں خود سے ہی الجھتی ہوں
ہوا کو کیسے سمجھاؤں
کہ دل کے ٹوٹ جانے سے
بڑا ہی درد ہوتا ہے۔
بڑی تکلیف ہوتی ہے۔
کبھی موسم ستاتے ہیں۔
کبھی آنسو ستاتے ہیں۔
ہوا کو کیسے سمجھاؤں
یہی دستورِ زمانہ ہے
کہ دنیا درد ہی دیتی ہے
لہجے سرد ہی دیتی ہے
تو پھر
یہ سازشیں کیسی؟
سمجھ جاؤ کہ
ہم دونوں اسی سازش کا حصہ ہیں۔


دسمبر کی اداس راتیں ہوں گی
درد میں ڈوبی آنکھیں ہوں گی
ہوا میں دکھ کے بجتے گھنٹے
ہجر کی پھر یادیں ہوں گی
آہ!
وہ ساری باتیں ہوں گی
کیسے ان سے دوری ہو
درد سے بھی دوری ہو
آہ!
یہ جو مجبوری ہے
یہ بھی تو ضروری ہے
کس قدر جبرِ مسلسل
سہنا بھی تو ضروری ہے
ریت یہ پرانی ہے
ریت بھی نبھانی ہے
آہ!
اے دسمبر
پھر سے ریت نبھانے کا
وقت قریب
آن پہنچا ہے۔
کچھ انتظامِ کربِ الفت میں کر لوں
کہیں دیر نہ ہو جائے
کہیں دیر نہ ہو جائے
آہ دسمبر!
صفیہ انور صفی


یادوں کی پٹاری
فی الحال نہ کھولو
یادوں کی پٹاری کو
میں ذرا
دسمبر سے نمٹ لوں
صفیہ انور صفی

افتخار شوکت

دسمبر لوٹ آتا ہے

دسمبر میں
تمہاری یاد کی شاخوں پہ
تازہ پھول آتے ہیں
دسمبر میں
تمہاری یاد کے رستوں
پہ چلتے چلتے خود کو بھول آتے ہیں

دسمبر میں
ہوائیں خود دریچے کھول کر
آتی ہیں کمرے میں
مری ٹیبل پہ ہوتی ہیں
تمہارے نام کی نظمیں
دسمبر کی ہوا ان کو اُڑاتی ہے
پرندوں کی طرح
ان دیکھے دیسوں میں
انہیں وہ لے کے جاتی ہے
دسمبر میں
کوئی بھی ہجر ہو یا وصل
وہ تکمیل پاتا ہے
اسی خاطر دسمبر لوٹ آتا ہے

اسے کہنا دسمبر لوٹ آیا ہے

ہوائیں سرد ہیں اور وادیاں بھی
دھند میں گم ہیں
پہاڑوں نے برف کی شال پھر سے
اوڑھ رکھی ہے
سبھی رستے تمہاری یاد میں پُرنم
سے لگتے ہیں
جنہیں شرفِ مسافت تھا
وہ سارے کارڈز
وہ پرفیوم
وہ چھوٹی سی ڈائری
وہ ٹیرس
وہ چائے
جو ہم نے ساتھ میں پی تھی
تمہاری یاد لاتے ہیں
تمہیں واپس بلاتے ہیں
اسے کہنا
کہ دیکھو یوں ستاؤ نا
دسمبر لوٹ آیا ہے
سنو تم لوٹ آؤ نا....



شگفتہ ناز

دسمبر!

نومبر گیا اور آیا دسمبر
کہ ساتھ اپنے سردی ہے لایا دسمبر

عجب ہم بھی ہیں چین ہم کو نہیں ہے
تھے سب منتظر کیوں نہ آیا دسمبر

پڑی تھی یہ موسم کی گرمی بلا کی
دیا رب نے پھل کیسا چھایا دسمبر

سبھی ماہ ہوتے ہیں موسم کے یکساں
مگر سب کو دل سے ہے بھایا دسمبر

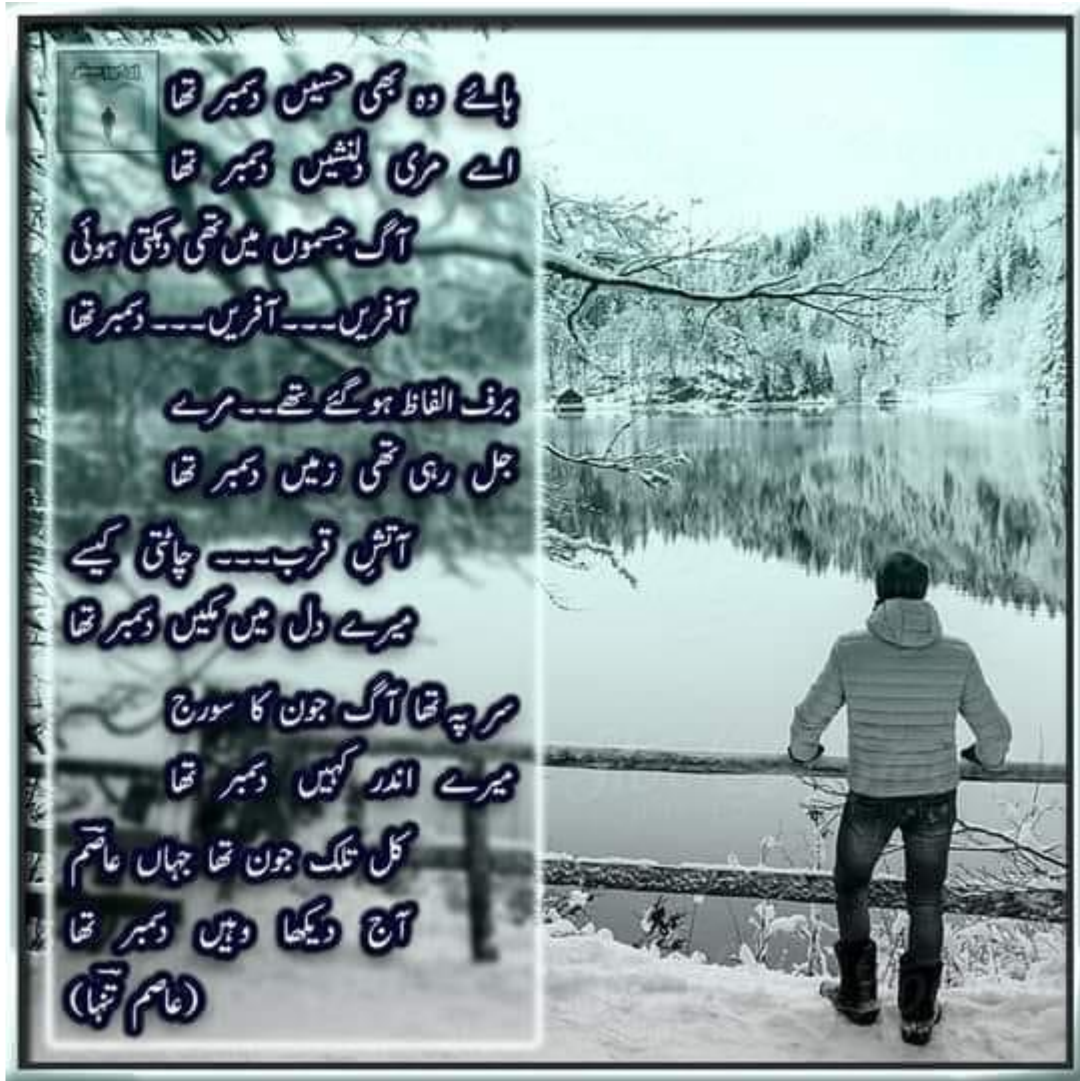
شگفتہ اگر بات دل کی جو پوچھو
تو سمجھو کہ میں نے بلایا دسمبر



لیڈر کا خطاب

ناصر بشیر
nasirbashir1968@gmail.com

کہو تو کھینچ کے لاؤں کہیں سے ابرِ کرم؟
مگر نہیں، تمھیں کافی ہے، دیدۂ پُرنم!
کہو تو لاؤں تمھارے لیے میں آبِ حیات؟
مگر نہیں، ہے مرا عرصۂ حیات ہی کم!
کہو تو لاؤں تمھارے لیے چراغ کوئی؟
مگر نہیں، مجھے رکھنا ہے تیرگی کا بھرم!
کہو تو تم کو سناؤں نویدِ فصلِ بہار؟
مگر نہیں، ابھی مضبوط ہیں خزاں کے قدم
کہو تو بھٹکے ہوؤں کو میں راہ پر لاؤں؟
مگر نہیں، یہی تھامے ہوئے ہیں میرا علَم
کہو تو آگ لگا دوں، ہجومِ اعداء میں؟
مگر نہیں کہ بہت سے ہیں ان میں میرے صنم
مرے ضمیر کا آئینہ سچ ہی کہتا ہے
دل و دماغ میں میرے فتور رہتا ہے


ہائے وہ بھی حسیں دسمبر تھا
اے مری دلنشیں دسمبر تھا
آگ جسموں میں تھی دہکتی ہوئی
آفریں۔۔۔آفریں۔۔۔دسمبر تھا
برف الفاظ ہو گئے تھے۔۔مرے
جل رہی تھی زمیں دسمبر تھا
آتشِ قرب۔۔۔ چاٹتی کیسے
میرے دل میں مکیں دسمبر تھا
سر پہ تھا آگ جون کا سورج
میرے اندر کہیں دسمبر تھا
کل تلک جون تھا جہاں عاصمؔ
آج دیکھا وہیں دسمبر تھا
(عاصم تنہاؔ)



SARZAMEEN SPECIAL EDITION

نرگس نور لاہور

اک دسمبر میں حال کیا لکھوں؟
کیسے گزرا ہے سال کیا لکھوں؟

تیری یادوں سے کب ملی فرصت
بول. رنج و ملال. کیا لکھوں؟

کب ملے ہو تو کب بچھڑنا. ہے
اب یہ ہجر و وصال. کیا لکھوں؟

روک دیتا ہے. تجھ کو آنے سے
تیرے موسم کی چال کیا لکھوں؟

اپنے شانوں پہ تیری فرقت کی
کب سے اوڑھی ہے شال کیا لکھوں؟

روز ابھرے غروب ہونے کو
یہ عروج و زوال کیا لکھوں؟

اک نظر میں چرا لیا دل کو
ان نگاہوں کے جال کیا لکھوں؟

جو گزارے ہیں کرب و ہجراں میں
وہ مہینے وہ سال کیا لکھوں؟

تو ملا ہے دعاؤں کے صدقے
اس میں تیرا کمال کیا لکھوں؟

اہل قلم کا ترجمان | Ufaq0786@gmail.com | ظلم کے خلاف چٹان

روزنامہ افق

0312-5400326

ملتان، اسلام آباد
پاکستان

چیف ایڈیٹر: شہزاد افق

03 دسمبر 2020

دسمبر لوٹ آیا ہے
دسمبر کی ان سُرمئی شاموں میں
احساس ہر کسی کا پنہاں ہے
کوئی کھو کر ہے روتا
کوئی پا کر بھی تنہا ہے
ناجانے کیوں دسمبر میں
سبھی کے روگ کھلتے ہیں
کچھ اُکتائے سے لگتے ہیں
کچھ بیزار بیٹھے ہیں
کسی کی عادتوں میں اب
کوئی جیتا ہے مرتا ہے
کوئی خاموش پلکوں پر
سجائے خواب ہے بیٹھا
کوئی خوابوں کے دھاگے کو
پرو کر جا چکا ہے اب
ناجانے کیوں دسمبر نے
سبھی کے روگ اُٹھائے ہیں
ناجانے کیوں سبھی اس سے
ہوئے بیزار بیٹھے ہیں

رمشا غلام شبیر (سیالکوٹ)

غزل

چاہ میں ٹھنڈی ٹھار نہیں پیتی
تیری قسمیں یار نہیں پیتی

تیرے ساہنویں بہ کے پیواں
ایسے لئی تاں گھار نہیں پیتی

تیرے عشق پوائی چاہ جو
اوہ میں دوجی وار نہیں پیتی

ہور کسے دے بلھ نیں لگے
میں تے چاہ سرکار نہیں پیتی

جت گئی ساں عشق دی بازی
من کے اپنی ہار نہیں پیتی

کسراں اوہنوں صحت لبھدی
دل دے اوس بیمار نہیں پیتی

تیرے عشق دی چاہ میں شبنم
لے کے کدی ادھار نہیں پیتی

شبنم کنول

نظم: مجھ سے ملنے آتے ہیں
تمہارے جانے کے بعد
مجھ سے ملنے آتے ہیں
رنگوں اور بہاروں سے
روٹھے ہوئے زرد موسم
مسرتوں سے خالی جشن
خوشیوں سے ناآشنا تہوار
شاعر: میاں وقار الاسلام
MIAN WAQAR UL ISLAM | FOUNDER | WAQAR-E-PAKISTAN | PRINCIPAL CONSULTANT | MARVEL SYSTEM
PERSONAL: MIANWAQAR.COM | PROFESSIONAL: MARVELSYSTEM.COM | LITERARY: WAQAREPAKISTAN.COM
MARVEL SYSTEM

نظم: تمہاری یادوں کے سہارے

تمہاری یادوں کے پت جھڑ
تمہاری یادوں کی رم جھم
تمہاری یادوں کی بہاریں
تمہاری یادوں کے دھند لکے
ہم نے اک زندگی جی ہے
تمہاری یادوں کے سہارے

شاعر: میاں وقار الاسلام

MIAN WAQAR UL ISLAM | FOUNDER | WAQAR-E-PAKISTAN | PRINCIPAL CONSULTANT | MARVEL SYSTEM
PERSONAL: MIANWAQAR.COM | PROFESSIONAL: MARVELSYSTEM.COM | LITERARY: WAQAREPAKISTAN.COM

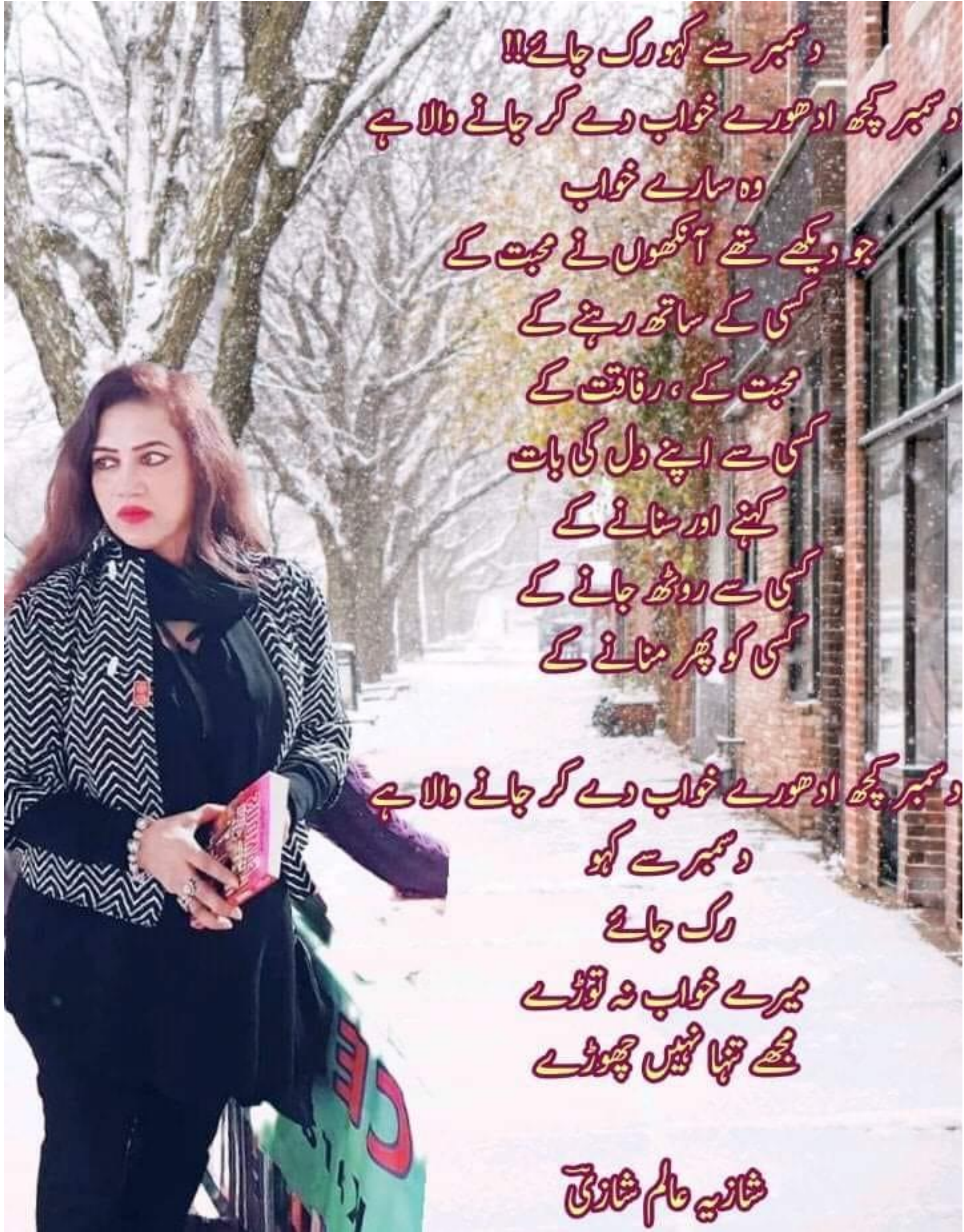
MARVEL SYSTEM

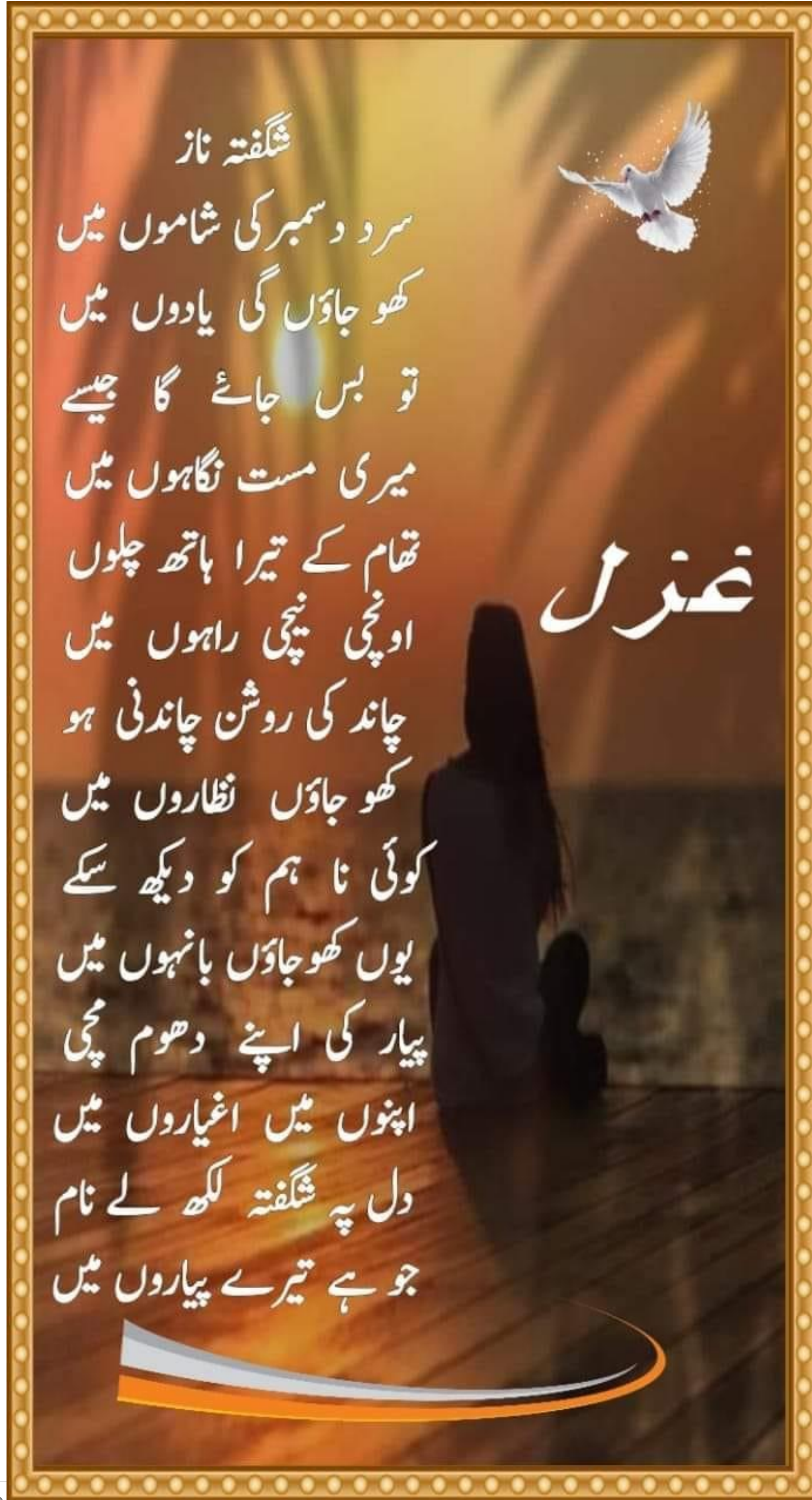
پت جھڑ کے تھپیڑوں نے تھے خاشاک سمیٹے
جذبوں کی حرارت نے مجھے آگ لگا دی

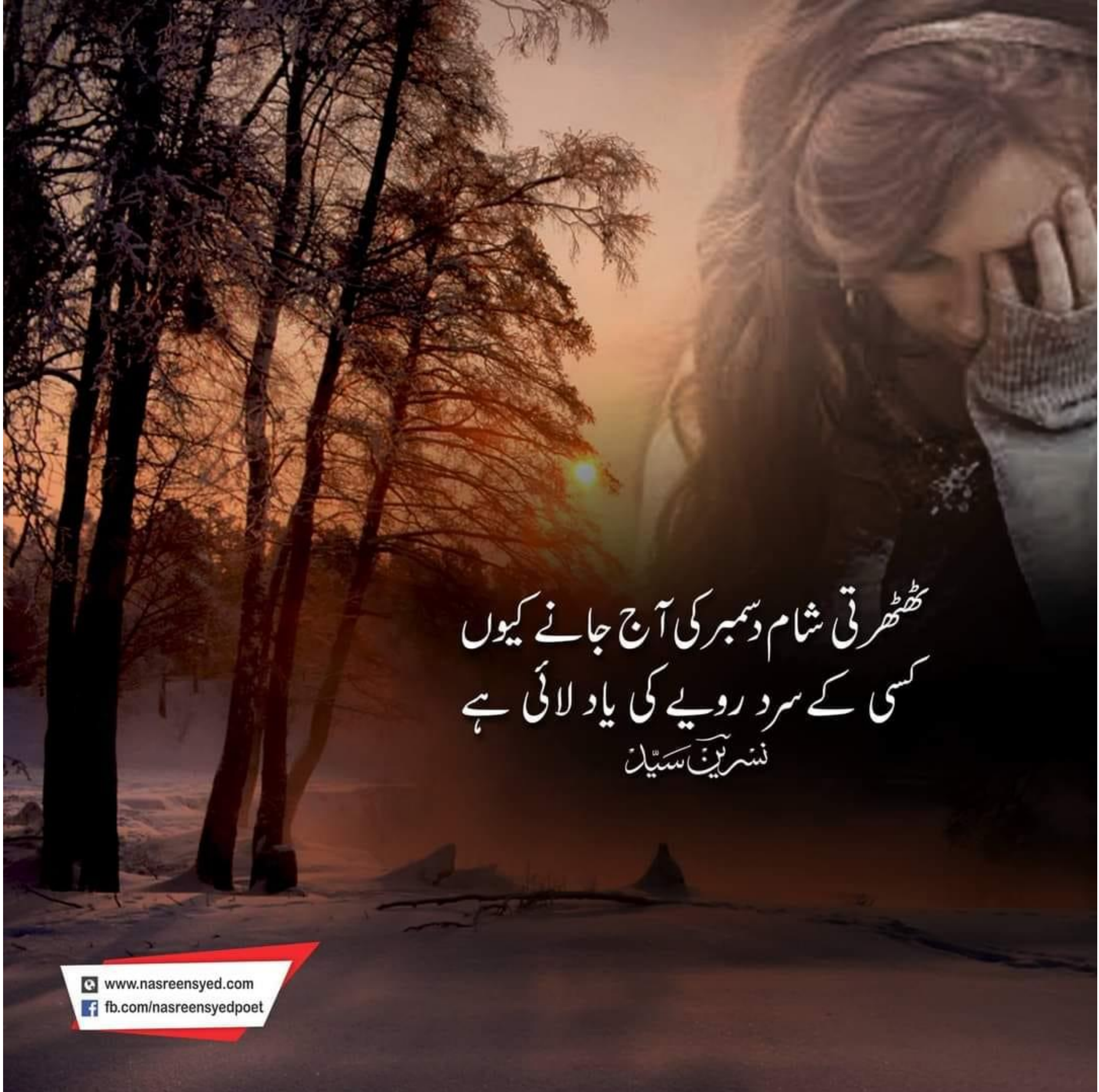
شاعر: میاں وقار الاسلام
تصنیف: سوز محشر

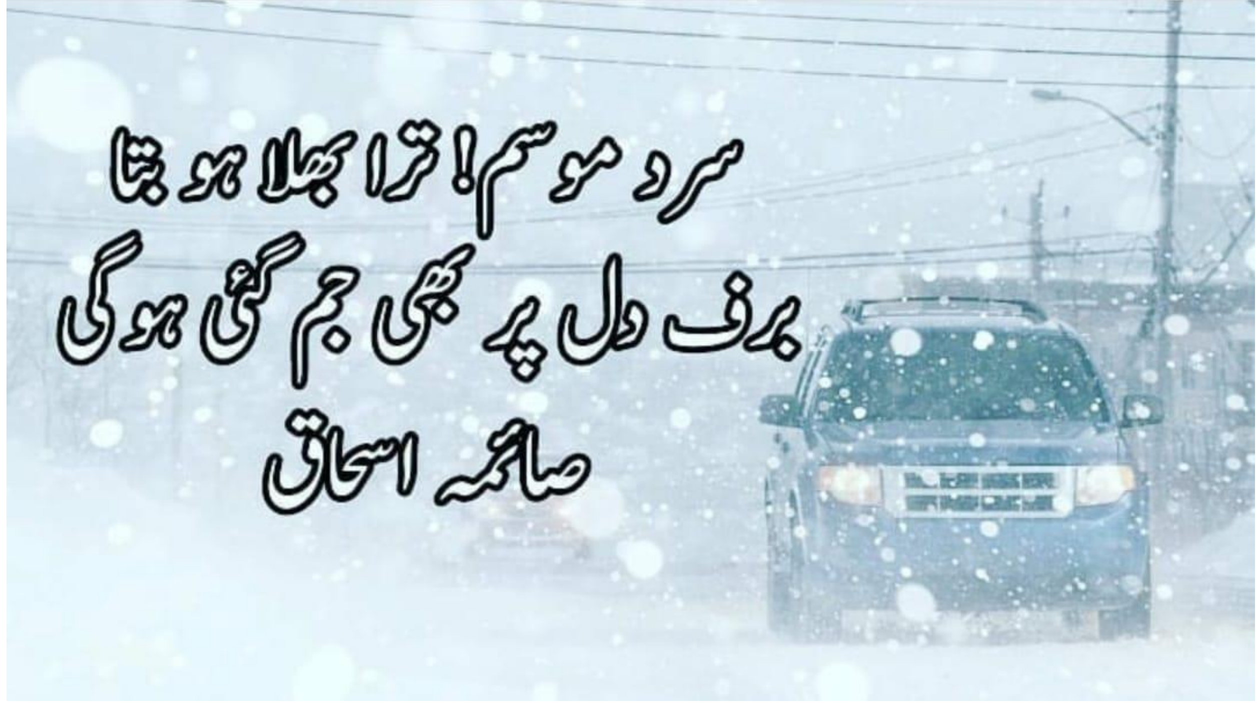
MIAN WAQAR UL ISLAM | FOUNDER | WAQAR-E-PAKISTAN | PRINCIPAL CONSULTANT | MARVEL SYSTEM
PERSONAL: MIANWAQAR.COM | PROFESSIONAL: MARVELSYSTEM.COM | LITERARY: WAQAREPAKISTAN.COM

MARVEL SYSTEM


دسمبر سے کہو رک جائے!!
دسمبر کچھ ادھورے خواب دے کر جانے والا ہے
وہ سارے خواب
جو دیکھے تھے آنکھوں نے محبت کے
کسی کے ساتھ رہنے کے
محبت کے ، رفاقت کے
کسی سے اپنے دل کی بات
کہنے اور سنانے کے
کسی سے روٹھ جانے کے
کسی کو پھر منانے کے
دسمبر کچھ ادھورے خواب دے کر جانے والا ہے
دسمبر سے کہو
رک جائے
میرے خواب نہ توڑے
مجھے تنہا نہیں چھوڑے
شازیہ عالم شازی


شگفتہ ناز
سرد دسمبر کی شاموں میں
کھو جاؤں گی یادوں میں
تو بس جائے گا جیسے
میری مست نگاہوں میں
تھام کے تیرا ہاتھ چلوں
اونچی نیچی راہوں میں
چاند کی روشن چاندنی ہو
کھو جاؤں نظاروں میں
کوئی نا ہم کو دیکھ سکے
یوں کھو جاؤں بانہوں میں
پیار کی اپنے دھوم مچی
اپنوں میں اغیاروں میں
دل پہ شگفتہ لکھ لے نام
جو ہے تیرے پیاروں میں
غزل


ٹھٹھرتی شام دسمبر کی آج جانے کیوں
کسی کے سرد رویے کی یاد لائی ہے
نسرین سیّد
www.nasreensyed.com
fb.com/nasreensyedpoet


سرد موسم! ترا بھلا ہو بتا
برف دل پر بھی جم گئی ہو گی
صائمہ اسحاق

خواب رستوں پہ چل رہی ہوں میں
سرد موسم میں جل رہی ہوں میں
میں جو بکھری وہ ایک لمحہ تھا
لمحہ لمحہ سنبھل رہی ہوں میں
سلجھی اک فکر و آگہی لیکر
اُلجھے خوابوں میں پل رہی ہوں میں
علمِ فردا کا علم کس کو ہے
آج موجود، کل رہی ہوں میں
زندگی سی طویل قامت رات
موم جیسی پگھل رہی ہوں میں
تجھ کو منظور ہو کہ نا منظور
حسرتِ دل، نکل رہی ہوں میں

رضیہ سبحان

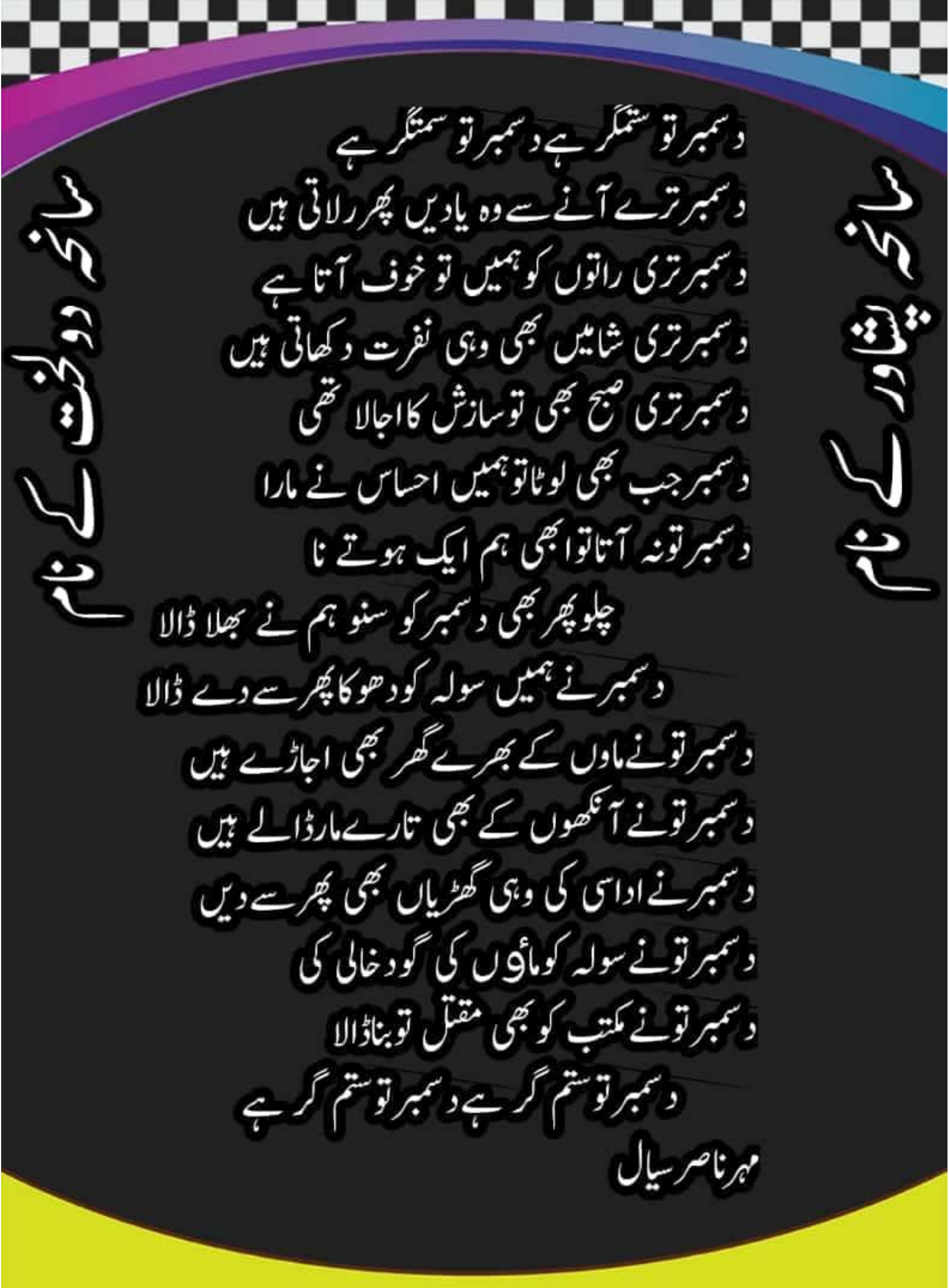

تیری چاہت کی شال اوڑھے ہوئے
سال اک اور کٹ گیا میرا
نادیہ سحر

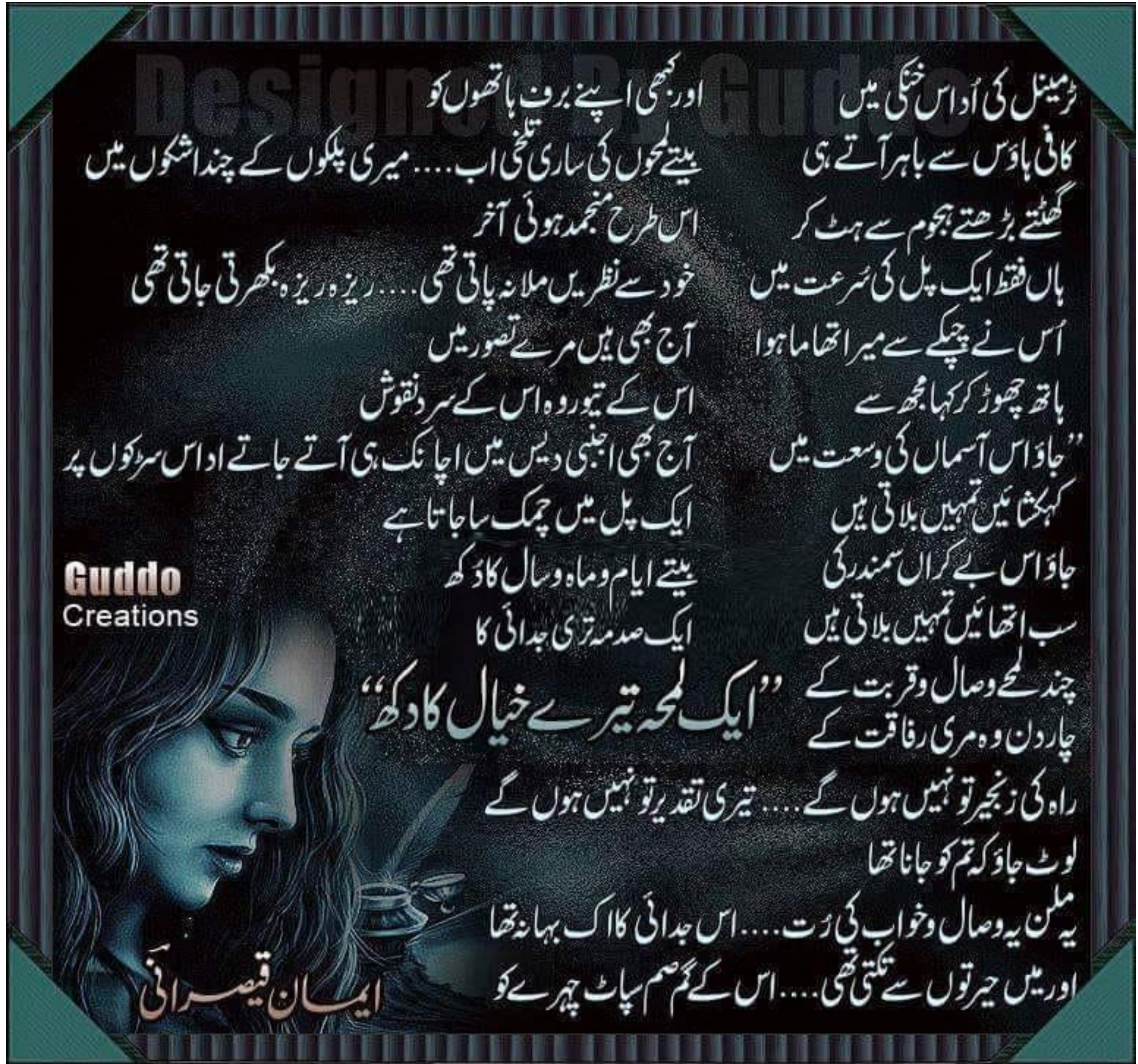
اس سال کا دسمبر بھی اداس ہے
ہونٹوں پہ اب بھی میرے پیاس ہے
اوڑھ لی دسمبر نے چاہتوں کی برفیلی چادر
پر نصیب کو میرے صحرا ہی راس ہے
میں بھول بیٹھی ہوں تمہاری چاہت کو۔ مجھے لگتا ہے یہ محض تمہارا
قیاس ہے
عشق کے مرحلے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں
کبھی خوشی تو کبھی غم آس پاس ہے
چھڑ دی کسی نے ادھورے عشق کی بات۔ میں تیری پارو اور تو میرا
دیوداس ہے
از قلم فرزانہ آسی




تمھیں ہماری جو یاد آئے، تو لوٹ آنا
یہ ہجر تم کو جو کاٹ کھائے، تو لوٹ آنا
مسافرت کا جنون طاری ہے سر پہ لیکن
کہ رہ میں مشکل جو پیش آئے، تو لوٹ آنا
تمھاری یادوں کے دیپ ہم نے جلا رکھے ہیں
اگر کوئی شمع ٹمٹمائے، تو لوٹ آنا
خوشی کی ٹھنڈک نثار تم پہ کروں گی جاناں
غموں کی آتش تمھیں جلائے، تو لوٹ آنا
اُجاڑ دُنیا، اُجاڑ عالم، خزاں کا موسم
غزل ہماری جو گنگنائے، تو لوٹ آنا
تو لوٹ آنا جو باغِ خواہش کی بو ستائے
کوئی جو تتلی تمھیں ستائے، تو لوٹ آنا
مروتوں کے ہیں باب ازبر، اے میرے دلبر
اگر تو منزل کی رہ نہ پائے، تو لوٹ آنا
تمھیں قسم ہے اے ماہِ تاباں، اے جانِ جاناں
کوئی کسی کو اگر منائے، تو لوٹ آنا
یہ در ہمارا کھلا ہے اے رابعہ ہمیشہ
تمھاری آنکھوں میں اشک آئے، تو لوٹ آنا
(رابعہ ملک)


مگر میں کیسے پرسہ دوں؟
مرے کانوں میں چیخیں ہیں
مرے معصوم بچوں کی
مری آنکھوں کے تاروں کی
کہ جن کے کھیلنے کے دن تھے
لیکن ظالموں نے ان سے کیسا کھیل کھیلا تھا
مرے بچوں سے اس دن موت کھیلی تھی
مری آنکھوں میں منظر ہیں
بہت سفاک منظر ہیں
کہیں بکھری کتابیں ہیں
کہ جن پر موت لکھی ہے
کہیں بستہ ہے کاپی ہے
کہ جن پر خون کے دھبے
رُلائیں خون کے آنسو
کسی منظر میں مائیں، بین کرتی ہیں
کہیں پھولوں کی لاشوں پر
بہت سے پھول رکھے ہیں
مجھے ماؤں کی چیخیں رات بھر سونے نہیں دیتی
کہ میں ان سرد راتوں میں
یہ گھنٹوں سوچتی ہوں بس
میں پرسہ دے سکوں گی کیا
انہیں اب اپنی نظموں سے؟
میں کیسے ان کے دکھ کو اپنی نظم میں ڈھالوں؟
خدا سے پوچھنا چاہوں
کہ یارب تیری دھرتی پر اگر یہ ظلم ٹوٹا ہے
زمیں کیوں کر سلامت ہے؟
قیامت کیوں نہیں آئی؟
میں شکوہ کر نہیں سکتی، جواب آئے گا شکوے کا
تمہارا فرض بھی کچھ تھا
اگر تم قوم بن جاتے
تو یہ دن بھی نہیں آتا
مجھے شکوہ نہیں کرنا
مجھے پرسہ تو دینا ہے
مجھے ان سب دکھوں کو اپنی نظموں میں بھی لکھنا ہے
مرے آنسو بھی حاضر ہیں
مری یہ نظم نذرانہ
مگر میں کیسے پرسہ دوں
کہ یارب میں بھی تو ماں ہوں
سو ماں کا دکھ سمجھتی ہوں
مجھے معلوم ہے ایسے دکھوں کا تیری دنیا میں
مداوا ہو نہیں سکتا
کبھی بھی دل گرفتہ ماں کو پرسہ ہو نہیں سکتا
تڑپتی ماں کو اب دلاسہ ہو نہیں سکتا
ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ


دسمبر تو ستمگر ہے دسمبر تو ستمگر ہے
دسمبر ترے آنے سے وہ یادیں پھر رلاتی ہیں
دسمبر تری راتوں کو ہمیں تو خوف آتا ہے
دسمبر تری شامیں بھی وہی نفرت دکھاتی ہیں
دسمبر تری صبح بھی تو سازش کا اجالا تھی
دسمبر جب بھی لوٹا تو ہمیں احساس نے مارا
دسمبر تو نہ آتا تو ابھی ہم ایک ہوتے نا
چلو پھر بھی دسمبر کو سنو ہم نے بھلا ڈالا
دسمبر نے ہمیں سولہ کو دھوکا پھر سے دے ڈالا
دسمبر تو نے ماؤں کے بھرے گھر بھی اجاڑے ہیں
دسمبر تو نے آنکھوں کے بھی تارے مار ڈالے ہیں
دسمبر نے اداسی کی وہی گھڑیاں بھی پھر سے دیں
دسمبر تو نے سولہ کو ماؤں کی گود خالی کی
دسمبر تو نے مکتب کو بھی مقتل تو بنا ڈالا
دسمبر تو ستم گر ہے دسمبر تو ستم گر ہے
مہر ناصر سیال


Designed By Guddo
"ایک لمحہ تیرے خیال کا دکھ"
ٹرمینل کی اُداس خنکی میں
کافی ہاؤس سے باہر آتے ہی
گھٹتے بڑھتے ہجوم سے ہٹ کر
ہاں فقط ایک پل کی سُرعت میں
اُس نے چپکے سے میرا تھاما ہوا
ہاتھ چھوڑ کر کہا مجھ سے
"جاؤ اس آسماں کی وسعت میں
کہکشائیں تمہیں بلاتی ہیں
جاؤ اس بے کراں سمندر کی
سب اتھائیں تمہیں بلاتی ہیں
چند لمحے وصال و قربت کے
چار دن وہ مری رفاقت کے
راہ کی زنجیر تو نہیں ہوں گے.... تیری تقدیر تو نہیں ہوں گے
لوٹ جاؤ کہ تم کو جانا تھا
یہ ملن یہ وصال و خواب کی رُت.... اس جدائی کا اک بہانہ تھا
اور میں حیرتوں سے تکتی تھی.... اس کے گم صم سپاٹ چہرے کو
اور کبھی اپنے برف ہاتھوں کو
بیتتے لمحوں کی ساری تلخی اب.... میری پلکوں کے چند اشکوں میں
اس طرح منجمد ہوئی آخر
خود سے نظریں ملا نہ پاتی تھی.... ریزہ ریزہ بکھرتی جاتی تھی
آج بھی ہیں مرے تصور میں
اس کے تیور وہ اس کے سرد نقوش
آج بھی اجنبی دیس میں اچانک ہی آتے جاتے اداس سڑکوں پر
ایک پل میں چمک سا جاتا ہے
بیتتے ایام و ماہ و سال کا دُکھ
ایک صدمہ تری جدائی کا
Guddo Creations
ایمان قیصرانی


وقار پاکستان
WP